جونؔ ایلیا کے انشائیوں کا موضوعاتی مطالعہ

(فرنود کے خصوصی حوالے سے)

مقالہ نگار:

بینش گل

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ستمبر ۲۰۱۸ء

جونؔ ایلیا کے انشائیوں کا موضوعاتی مطالعہ

(فرنود کے خصوصی حوالے سے)

مقالہ نگار:

بینش گل

ایم اے (اُردو)، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، 2018ء

یہ مقالہ

ایم۔فل (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ستمبر ۲۰۱۸ء

مقالے کے دفاع اور منظوری

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: جونؔ ایلیا کے انشائیوں کا موضوعاتی مطالعہ (فرنود خصوصی حوالے سے)

پیش کار: بینش گل

رجسٹریشن نمبر: 1101/M/U/F15

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اُردو زبان و ادب

ڈاکٹر صائمہ نذیر _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان _____

ڈین آف لینگویجز

بریگیڈیئر محمد ابراہیم _____

(ڈائریکٹر جنرل)

_____

تاریخ

اقرارنامہ

میں بینش گل حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اِس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے ایم۔فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر صائمہ نذیر کی زیر نگرانی مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا اِدارے میں ڈگری کے حصول کے لئے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

_____

بینش گل

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ستمبر ۲۰۱۸ء

فہرست ابواب بندی

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم		iii
اقرار نامہ		iv
فہرست ابواب بندی		v
مقالے کا دائرہ کار		vi
Abstract		vii
مقالے کا مقصد		viii
اظہارِ تشکر		ix
باب اوّل:	انشائیہ نگاری کی روایت اور جونؔ ایلیا کی انشائیہ نگاری کا مختصر جائزہ	۱
	حوالہ جات	۲۷
باب دوم:	سماجی موضوعات	۲۸
	حوالہ جات	۶۲
باب سوم:	سیاسی و فلسفیانہ موضوعات	۶۳
	حوالہ جات	۹۶
باب چہارم:	تاریخی، علمی و ادبی، نفسیاتی اور مذہبی موضوعات	۹۷
	حوالہ جات	۱۳۱
باب پنجم:	مجموعی جائزہ	۱۳۲
(الف)	نتائج	۱۵۳
(ب)	سفارشات	۱۵۵
(ج)	کتابیات	۱۵۶

مقاصد کا دائرہ کار

یہ تحقیقی کام "جونؔ ایلیا کے انشائیوں کا موضوعاتی مطالعہ" فرنود میں شامل انشائیوں پر مشتمل ہیں۔ اس تحقیقی کام میں جونؔ کے انشائیوں کو موضوعات کے حوالے سے زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ جس میں سماجی، سیاسی، فلسفیانہ، تاریخی، علمی و ادبی، نفسیاتی اور مذہبی موضوعات شامل ہیں۔ انشائیہ ایک ایسی صنف ہے جو کہ مغرب سے ہمارے ہاں آئی اور اُردو کے ادیبوں نے اس میں طبع آزمائی کی۔ ابتداء میں یہ الگ صنف کے طور پر تو رائج نہیں تھی لیکن رفتہ رفتہ اس نے اپنی شکل نکھاری اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ یہ الگ صنف کے طور پر سامنے آئی اور پھر اس میں لکھنے والوں میں اضافہ ہوتا رہا۔

جونؔ ایلیا نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ جونؔ اس سے پہلے شاعری میں اپنا نام پیدا کر چکے تھے اور شاعری میں انہیں ایک الگ اور نمایاں مقام حاصل تھا لیکن جب انہوں نے انشائیہ کی طرف توجہ کی تو اس صنف میں بھی ان کی انفرادیت واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ اس تحقیقی مقالے کا مقصد چونکہ جونؔ کو بحیثیت انشائیہ نگار معارف کروانا اور ان کی انفرادیت کو واضح کرنا ہے اِس لیے اِن کے انشائیوں کے متنوع قسم کے موضوعات کو اس تحقیقی مقالے میں بیان کیا گیا ہے کیونکہ جونؔ نے ان تمام موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے جو کہ قوم کی اصلاح کے حوالے سے مفید تھے اور معاشرے کی جڑوں میں پیوست ہو رہی تھیں۔ اِسی طرح تاریخ کو بھی نہایت عمدگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور نفسیاتی حوالے سے بھی معاشرے کے افراد کی انفرادی و اجتماعی نفسیات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مذہبی حوالے سے ان خامیوں کو بھی بیان کرتے نظر آتے ہیں جو کہ اسلام کے لیے خطرہ بن رہی ہیں۔

اس تحقیقی مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں انشائیہ نگاری کی روایت کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ جونؔ کی انشائیہ نگاری کو بھی مختصر بیان کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں جونؔ کے ہاں سماجی موضوعاتی پر مبنی انشائیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں سیاسی و فلسفیانہ موضوعات پر بات کی گئی ہے۔ چوتھے باب میں ان تمام انشائیوں کو بیان کیا گیا ہے جو کہ تاریخی، علمی و ادبی، نفسیاتی اور مذہبی موضوعات پر مبنی تھے۔ جب کہ پانچویں باب میں مجموعی جائزہ، نتائج اور سفارشات شامل ہیں۔

ABSTRACT

"Poem in Urdu" wanders here and there in the environmental outskirts in search of its topics and having found its jewel, a poet with sensitive mind, with his poetic attitude and aptitude, and choice of words, finds such topics with whose embellished use provides his reader and critic with ample material. Our society has been facing terrorism for decades. In such an environment, poetic figminations and angles find new horizons.

Urdu – particularly poem in Urdu evolved in atmosphere of tyranny, terror, frightfulness, the poets, at topic level and with choice of words have excelled this in a decorated manner and have tried to abolish the atmosphere of horror and terror and have brought ease and comfort to the society. To revive this comfort and peace, the poets of poem in Urdu have used various narratives, different steps and angles of this narrative is the prime purpose of this research.

مقالے کا مقصد

میرے ایم فل کے مقالے کے موضوع "جونؔ ایلیا کے انشائیوں کا موضوعاتی مطالعہ (فرنود کے خصوصی حوالے سے)" ٹھہرا۔ جس میں جونؔ کی انشائیہ نگاری پر بات کرنے کے ساتھ ساتھ جونؔ انشائیوں میں ملنے والے متنوع قسم کے موضوعات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس تحقیقی مقالے کا مقصد جونؔ کو بحیثیت انشائیہ نگار متعارف کروانا ہے کیونکہ جونؔ ایک شاعر کے طور پر تو اپنا ایک الگ اور نمایاں مقام رکھتے ہیں لیکن ان کی انشائیہ نگاری کے پہلو سے بہت کم لوگ واقفیت رکھتے ہیں۔ اس لیے اس تحقیقی مقالے میں جونؔ کے انشائیوں میں بیان کیے گئے تمام موضوعات کو سامنے لایا گیا ہے اور پر مفصل انداز میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ جس سے ان کی انفرادیت واضح ہو کر سامنے آتی ہے اور سیاسی و سماجی صورت حال کا جونؔ اور ان کے انشائیوں پر اثرات کا پتا چلتا ہے۔

اظہارِ تشکر

ایم فل اُردو کے کورس ورک کے بعد جب تحقیقی مقالہ لکھنے کا مرحلہ آیا تو ڈاکٹر صائمہ نذیر کی رہنمائی سے میرے تحقیقی مقالے کا موضوع "جون آیلیا کے انشائیوں کا موضوعاتی مطالعہ (فرمود کے خصوصی حوالے سے)" ٹھہرا۔ میرے مقالے کی نگران ڈاکٹر صائمہ نذیر مقرر ہوئیں۔ جن کی رہنمائی سے یہ مشکل اور دقیق تحقیقی و تجزیاتی کام آسان ٹھہرا۔ مقالے کی تکمیل کے لیے نمل کی لائبریری، ادارہ فروغ زبان اُردو کی لائبریری، اُردو تحقیقات، اُردو کی لائبریری اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی لائبریری سے استفادہ کیا گیا اور بالآخر تحقیقی کام پایہ تکمیل تک پہنچا۔ راقمہ اپنے مقالے کی تکمیل پر سب سے پہلے اللہ کی شکر گزار ہے جس نے مقالے کو مکمل کرنے کی ہمت اور توفیق دی اور اس مشکل تحقیقی کام کو سہل بنایا۔ راقمہ مقالے کی تکمیل پر ڈاکٹر صائمہ نذیر کی تہہ دل سے شکر گزار ہے جن کی قدم قدم پر رہنمائی اور سرپرستی نے حوصلہ بڑھیا۔ راقمہ اپنے تمام اساتذہ کرام کی ممنون ہے جن کی تربیت اور رہنمائی نے راقمہ کو مقالے کی بروقت تکمیل ممکن بنانے میں مدد دی۔ مقالے کے آخر میں راقمہ اپنے والدین کی بھی شکر گزار ہے جن کی دُعائیں شاملِ حال رہیں۔

بینش گل

باب اوّل:

"انشائیہ نگاری کی روایت"

کسی بھی صنف کی تعریف متعین کرنا بذاتِ خود ایک مشکل عمل ہے، لیکن اسے ناممکن قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگر متعین تعریف کے سلسلے میں لغات کی طرف رجوع کیا جائے تو کم از کم معنویت ضرور سامنے آجائے گی۔ فرہنگِ آصفیہ، فیروز اللغات، جامع اللغات اور دیگر کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انشائیہ کا لفظ "انشا" سے نکلا ہے اور اس عربی النسل لفظ کے معنی عبارت، تحریر، دل سے بات پیدا کرنا، علم معانی و بیان، صنائع و بدائع، خوبی عبارت، طرز تحریر اور وہ جملہ جس میں سچ اور جھوٹ کا گمان ہو، سامنے آتے ہیں۔ انشائیہ کے یہ لغوی معانی بیان کر دینے سے مدعا واضح نہیں ہوتا۔ سید محمد حسنین کے موجب انشا کا مادہ "نشا" (نش ءا) ہے جس کے لغوی معنی پیدا کرنے کے ہیں۔ یعنی انشا کی علتِ غلیت، زائید گی یا آخرید گی ہے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی "کشاف تنقیدی اصطلاحات میں لکھتے ہیں۔

> انشائیہ ایک اصطلاح کی حیثیت سے Essay کا ترجمہ ہے۔ پہلے پہل اسے بھی مضمون ہی کہا جاتا تھا۔ لیکن مضمون ایک ایسی عام اصطلاح ہے جس کی حدود میں سوانحی مضمون، تحقیقی مقالہ حتی کہ اخبار کا مقالہ اختتامیہ بھی شامل ہو جاتا ہے مضمون کی اس قسم کے لیے کسی نئے لفظ کی ضرورت تھی چنانچہ وزیر آغا نے انشائیہ کا لفظ تجویز کیا، جو اب اصطلاح کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔[1]

اردو میں انشائیہ کا لفظ انگریزی لفظ Essay کے مترادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ Essay دراصل فرانسیسی لفظ ASSAI کے متبادل کے طور پر رائج ہوا۔ "انشا" کا لفظ بھی عربی النسل ہے اور ASSAI بھی عربی لفظ اسعی کی فرانسیسی شکل ہے اگرچہ عام خیال یہ ہے کہ ASSAI کا لفظ "کوش" کرنے کے معنوں میں یونانی زبان سے فرانسیسی میں منتقل ہوا لیکن حقیقت اس سے مختلف ہے۔ تاریخی حقائق کا جائزہ لیا جائے تو اندلس اور جنوبی فرانس پر اہلِ عرب کی زبان و ثقافت کے اثرات واضح دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فرانس میں لاطینی الفاظ سے بھی زیادہ عربی الفاظ و ترکیب کا استعمال پایا جاتا ہے لہٰذا ASSAI عربی لفظ "اسعی" ہی کا فرانسی املا ہے۔ اسعی کا مادہ "سعی" ہے یعنی "کوشش"۔ اب اگر اردو میں انشائیہ Essay کے

مترادف کے طور پر مستعمل ہے تو معنی کی قربت کے ساتھ ساتھ تخلیقی کوشش کے حوالے سے بھی اس لفظ کا استعمال زیادہ بامعنی ہو جاتا ہے۔ "سید محمد حسنین" نے جب انشائیے لفظ کو زائیدگی یا آفریدگی کے ساتھ جوڑا تھا تو غالباً "مشکور حسین یاد" کے ذہن میں یہی معنی ٹھہر گئے تھے۔

مشکور حسین یاد لکھتے ہیں۔

> میں انشائیہ کو ادب کی ام الاضاف کہا کرتا ہوں۔ انشائیہ ادب کا ایک فکری اظہار ہے اس لیے ہر ادیب اس کا موجد ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں جب اس کے ادب کا آغاز ہو تو انشائیہ وجود میں آیا۔[۲]

ادب کی ایک مخصوص اصطلاح کے طور پر لفظ "انشائیہ" کو 1971ء تک رائج سکہ کی حیثیت حاصل نہیں تھی اور اس کے لیے لطیف پارہ، خیال پارہ اور انشائیے لطیف وغیرہ تراکیب کے فروغ کی کوشش کی جارہی تھی، ثانیاً انشائیہ کا لفظ "وزیر آغا" کی شخصی اختراع نہیں بل کہ انہوں نے یہ لفظ کسی ادبی رسالے میں پڑھا اور اسے متذکرہ قسم کے مضامین کے مزاج سے ہم آہنگ پایا تو میرزا ادیب کے تعاون سے رسالہ "ادب لطیف" میں اس کا استعمال فرواں شروع کر دیا۔ گویا اس لفظ کے ابتدائی فروغ میں "ادب لطیف" نے سب سے زیادہ خدمات سرانجام دیں چناچہ اس رسالہ میں اس سے ملتی جلتی نوع کی جو تحریریں شائع ہوئیں انہیں انشائیہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ "وزیر آغا" کی اس کاوش کا نتیجہ یہ ہوا کہ مضمون اور انشائیہ کے درمیان ایک واضح حدِ امتیاز قائم ہوتی گئی۔ احمد جمال پاشا، عرش صدیقی، غلام جیلانی اصغؔر اور مشکور حسین یاد انشائیہ کی اصطلاح کو وزیر آغا سے منسوب کرتے ہیں۔ یوں ایک بڑا طبقہ انشائیہ کی اصطلاح کو "ڈاکٹر وزیر آغا" سے ہی موسوم کرتے ہیں، انھیں ہی انشائیہ کی تحریک کا بانی شمار کرتا ہے اور "خیال پارے" کی اشاعت کو اس صنفِ ادب کا باقاعدہ نقطہء آغاز گردانتا ہے۔

اس حوالے سے پروفیسر جمیل آذر کر لکھتے ہیں۔

> ڈاکٹر وزیر آغا پہلے ادیب ہیں جنہوں نے انشائیہ عناصرِ ترکیبی اور اس کی روح کو دریافت کیا۔ 1971ء میں اردو انشائیوں کا پہلا مجموعہ "خیال پارے" شائع ہو تو اس کی اشاعت کے ساتھ ہی اردو ادب میں جدید انشائیہ کی باقاعدہ تحریک کا آغاز ہو گیا۔[۲]

اُردو میں انشائیہ کی اصطلاح کا آغاز "ڈاکٹر وزیر آغا" سے ہوتا ہے اور "ڈاکٹر وزیر آغا" ہی اردو کے سب سے پہلے انشائیہ نگار ہیں۔ لیکن اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو "ڈاکٹر وزیر آغا" سے کہیں پہلے "اختر

اور نیوی" نے سب سے پہلے انشائیہ کا لفظ استعمال کیا۔ ۱۹۴۴ء میں "سید علی اکبر قاصد" کے انشائیوں کا مجموعہ "ترنگ" پٹنہ سے شائع ہو چکا تھا۔ اس کا تعارف "کلیم الدین احمد" اور دیباچہ "اختر اور نیوی" نے لکھا تھا۔ ۱۰۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب گیارہ انشائیوں پر مشتمل ہے۔

"اختر اور نیوی" نے "انشائیہ نگاری" کے عنوان سے جو دیباچہ لکھا اس کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

اردو ادب میں انشائیوں Essays اور خاکوں کی بڑی کمی ہے۔ کبھی کبھار کوئی اچھا سا انشائیہ پرچوں میں نکل آتا ہے تو دو گھڑی کے لیے جی بہل جاتا ہے۔ (۴)

اس تعریف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انشائیہ کی اصطلاح پہلے پہل اختر اور نیوی کے اس دیباچے میں نظر آتی ہے جو علی اکبر قاصد کی کتاب "ترنگ" میں شامل ہے۔ اس مضمون سے اگرچہ یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ انشائیہ کی اصطلاح انھوں نے "Essay" کے لیے پہلی بار استعمال کی ہے لیکن چونکہ اس سے قبل کسی تحریر میں "Essay " کے لیے انشائیہ کی اصطلاح نظر نہیں آتی اس لیے اس اصطلاح کے لیے "اختر اور نیوی" کا نام ہی اہمیت رکھتا ہے لہٰذا یہ بات درست ہے کہ انشائیہ کی اصطلاح "ڈاکٹر وزیر آغا" سے پہلے "اختر اور نیوی" کے ہاں نظر آتی ہے خصوصاً اس لیے بھی کہ انھوں نے انشائیہ کی صنف سے مکمل آگاہی کا ثبوت دیا ہے۔

ان کی باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سب سے پہلے "علی اکبر قاصد" کے مجموعے "ترنگ" کے دیباچہ نگار "اختر اور نیوی" نے انشائیہ کا لفظ بطور صنف استعمال کیا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس کو رورد دینے میں ڈاکٹر وزیر آغا اور ان کے ساتھیوں نے کافی فعال کردار ادا کیا۔

وزیر آغا انشائیہ نگاری کے سلسلے میں جس بات کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ انشائیہ نگار اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرنے کے ساتھ ساتھ مدلل اور استدلالی انداز کیوں اپنائے کیونکہ دراصل انشائیہ نگار کا کام تو یہ ہے کہ وہ سیدھے سادے انداز میں اپنے تاثرات اور محسوسات کو بیان کرتا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ استدلالی انشائیے میں سخت ممانعت ہے۔ انشائیہ نگار کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ اپنی بات منوانے کے لیے نہ تو زیادہ کوشش کرے اور نہ ہی زور دے۔

انشائیہ میں انشائیہ نگار کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر چیز سے متعلق اپنے ذاتی تاثرات بیان کرتا ہے اور اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ ہر چیز کے بارے میں پہلے سے موجود تاثرات یا مطلب کو بدل کر پیش کرے اس سے نہ صرف وہ اپنے شعور کو بڑھاتا ہے بلکہ قاری کو بھی اس سے لطف

حاصل ہوتا ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی اپنے خیالات بدلتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ انشائیہ نگار اپنے موضوع کے انوکھے پہلوؤں کو پیش کرتا ہے۔ موضوع بھی ہلکا پھلکا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ہے کہ انشائیے میں اختصار ہوتا ہے اور وہ کسی بھی چیز کو موضوع بنا سکتا ہے۔ انشائیے میں انشائیہ نگار کی اندرونی شخصیت جھلکتی ہے یعنی اندرونی تاثرات کا بیان ہوتا ہے اور باہر کے خیالات کم ہوتے ہیں مگر اندرونی زاویہ نظر سے اصلاح کے لیے انشائیہ نہیں لکھا جاتا اس کی کوئی خاص ہیت نہیں بل کہ مخصوص مزاج ہے جس سے اس کی پہچان ہو جاتی ہے۔

انشائیہ کسی حدود و قیود کا پابند نہیں بل کہ اس میں موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ انشائیہ نگار کسی بھی موضوع پر قلم نہیں اُٹھا سکتا ہے اور وہ انتہائی سادگی پُرکاری سے اپنا نقطہ نظر قاری کے سامنے بیان کر دیتا ہے۔ اسی طرح اس میں بعض اوقات ایسی باتیں نظر آتی ہیں جو دیکھنے میں تو بے معنی معلوم ہوتی ہیں اور غیر سنجیدہ لگتی ہیں لیکن در حقیقت وہی غیر سنجیدگی اور بے معنیت انشائیہ نگار کے نقطہ نظر کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور اسی ذریعے سے وہ اپنی رائے قاری تک پہنچاتا ہے اور اسے کسی بھی موضوع کے مختلف زاویوں سے روشناس کراتی ہے اور وہ زاویے بھی سامنے لاتا ہے۔ جو کہ قاری کی نظروں سے اوجھل تھے۔ "ڈاکٹر وزیر آغا" نے انشائیہ کے مقتیفات اور محاسن کو ایک اور انداز میں مجتمع کیا ہے۔ ان کے مطابق:

> انشائیہ اس نثری صنف کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیاء د یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور پر گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آکر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ (۵)

انشائیہ کی یہ تعریف جامع اور گتھی ہوئی ہے اور اس میں جدید انشائیہ کا مزاج سمایا ہوا بھی نظر آتا ہے اس میں انشائیے کے خدوخال، محاسن اور مقتیفات مثلاً نکتہ آفرینی، اسلوب کی تازہ کاری، ایک نیا مدار تخلیق کرنے اور ایثار اور مظاہر کے مخفی مفاہیم کو خلاقی سے اجاگر کرنے کے زاویے موجود ہیں۔ اس تعریف کے مطابق انشائیہ محض مجذوب کی رنگ یا ڈھیلی ڈھالی اور بے ربط ہیئت کا ادب پارہ نہیں بل کہ یہ فکر و احساس کو ندرت سے پیش کرنے کا وسیلہ بھی ہے۔

انشائیے کے حوالے سے کی گئی تمام تعریفوں کی رو سے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ انشائیہ کی لگے بندھے لفظوں میں تعریف نہیں ہو سکتی مگر انشائیوں کا مطالعہ کرنے سے اس کے خدوخال واضح ہو جاتے

ہیں۔ جب کوئی تخلیق کار بات سے بات نکالنے کے ہنر پر گرفت رکھتے ہوئے انکشافِ ذات کے مرحلے سے گزرتا ہے تو اس کی تخلیق میں انشائی عناصر بین السطور جمع ہوتے جاتے ہیں۔ جب کہ اس کے مقابلے میں ہیئتی طور پر ایک ہونے کے باوجود مضمون، مزاح پارہ اور فکاہیہ الگ سے پہچانے جاسکتے ہیں۔ اس بحث کو سمیٹتے ہوئے اتنا کہاجا سکتا ہے کہ قدیم اُردو ادیبوں میں ملا وجہی سے سر سید تک کی تحریریں انشائی عناصر کے حامل ہونے کے باوجود جدید انشائیے سے بہت حد تک مختلف تھیں۔ نئے آنے والے انشائیہ نگاروں نے زیادہ تر وزیر آغا کی مرتب کردہ انشائیے کی شعریات کو ملحوظ رکھا۔ اس لیے جدید انشائیہ انہی کے اختراع کردہ راستے پر گامزن ہے۔

یورپ میں انشائیے کی روایت:

انشائیے کی صنف کا بانی فرانسیسی مفکر "مانتین" سمجھا جاتا ہے جس نے اپنے شخصی تاثرات و تجربات کو ہلکے پھلکے انداز میں پیش کر کے انہیں Essay کا نام دیا ہے جس کے لغوی معنی "سعی و کوشش" کے ہیں۔ انگریزی Essay فرانسیسی Essai ہی کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ "مانتین" کے Essays آزادہ روی، شگفتگی، انکشافِ ذات اور غیر رسمی اندازِ بیان کی بناء پر بے حد مقبول ہوئے اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر انگریزی میں Essay کی صنف کے آغاز کا باعث بنے۔

مغرب میں انشائیے کے موجد و بانی فرانسیسی ادیب "مونتینؔ" نے اپنے آپ کو علمی موضوعات کے بارے میں اپنی ذاتی رائے تک محدود کر لیا ہے وہاں اس کی حیثیت ایک عام مفکر سے مختلف نہیں اور انشائیہ نگار دبا دبا سا نظر آتا ہے اور جہاں مونتینؔ نے قیدِ زماں سے بلند ہو کر اپنی ذات کو بے نقاب کیا ہے اور اپنی شخصیت کی گویا تصویریں بنائی ہیں وہاں وہ ایک خالص انشائیہ نگار نظر آتا ہے۔ ان تحریروں میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چار صدیاں بیت جانے اور انشائیے کے ارتقائی سفر میں متعدد نئی منزلیں طے کر لینے کے باوجود مونتینؔ اس صنفِ ادب کی سب اسے اہم شخصیت ہے اور اس کے ذکر کے بغیر انشائیے کی تاریخ کا ابتدائی سرا ہاتھ نہیں آتا۔

"مونتینؔ" کی وفات کے بعد انشائیے کے روایت نشاۃ ثانیہ عمل میں آئی۔ اس کے لیے قوت "بیکنؔ" نے فراہم کی اور اس کے انشائیوں نے ہی اس صنفِ ادب کو مقبولیت کی راہ پر ڈال دیا۔ لہٰذا اگر بیکنؔ کو انگریزی انشائیے کا بانی قرار دیا جاتا ہے تو یہ کچھ غلط نظر نہیں آتا۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ "بیکنؔ"

جس قسم کے انشائیے کا موجد تسلیم کیا گیا ہے اس میں عمل اور اس کی زور دار اداکاری کا انکشافِ ذات سے زیادہ اہم ہے۔

تنقیدی نقطہ نظر سے مطالعہ کرنے "پر بیکنؔ" کے Essays میں بعض خصوصیات بہت نمایاں نظر آتی ہیں ایسی خصوصیات جن پر ناقدین نے بے حد زور دیا ہے۔ ان میں سرِ فہرست Essay کا اختصار اور فقروں کی محاورات یا ضرب المثل جیسی ساخت ہے۔ مختصر ترین الفاظ میں بڑی سے بڑی اور گہری سے گہری بات نہایت کامیابی اور خوب صورتی سے ادا کرنا قادر الکلامی کی دلیل ہے۔ بیکنؔ نے ایسیز کے لیے جن موضوعات کا انتخاب کیا وہ پُر تنوع ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کے مسائل کے بارے میں بھی ہیں۔ صرف چند عنوانات سے اس کی ذہنی دلچسپیوں اور وسعت نگاہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

انگریزی ایسّے کا باوا آدم "سر فرانسس بیکنؔ" ہے۔ کیونکہ اس نے "جانِ فلوریو" کے ترجمے سے متاثر ہو کر سب سے پہلے مونیتنؔ کے انداز میں Essays قلم بند کیے۔ لیکن ان دونوں کی مشابہت بس اس حد تک ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ "مونتینؔ اور بیکن" کے Essays دو جداگانہ شخصیتوں کا اظہار ہیں۔ "بیکنؔ" فلسفیانہ مزاج اور استدلالی ذہن لے کر آیا تھا اس لیے اس کے Essays میں اظہارِ ذات کی بجائے اظہارِ علم ملتا ہے، فلسفیانہ سوچ ملتی ہے اور مسائل کا تجزیہ و تحلیل ہے۔ ان سب نے مل کر اس اسلوب کو "مونتین" کے اسلوب کے برعکس عالمانہ اور فاضلانہ بنا دیا۔

"بیکنؔ" کے بعد ایک نام ایسا ملتا ہے جس کے تذکرہ کے بغیر انگریزی Essay کی تاریخ نامکمل رہ جاتی ہے اور وہ نام "ابراہم کاؤلے" کا ہے۔ جسے "کاسلز انسائیکلوپیڈیا آف لٹریچر" کے آرٹیکل "Essay " کے مصنف کے الفاظ میں "بعض اوقات انگریزی Essay کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ "کاؤلے" بنیادی طور پر شاعر تھا اور اپنے زمانے کے اہم اور مقبول شعرا میں شمار کیا جاتا تھا۔ ۱۶۶۸ء میں اس کے Essays کا مجموعہ "Several Discourses by way Essay" کے نام سے طبع ہوا چارلس لیمب نے کاؤلے کے Essays کو ان لفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔

> میں اس کے ایسیز میں بات سے بات پیدا کرنے کے لطیف اندوز کو ایڈیسن کی روزی اور نازک خیالی پر ترجیح دیتا ہوں۔ لہٰذا موخر الذکر کی نفیس شگفتگی استثنائی حیثیت رکھتی ہے۔[۶]

اٹھارویں صدی کے اوائل مین انگریزی انشائیہ نگاری کے افق پر "رچرڈ سٹیل" اور "جوزف ایڈیسن" کا طلوع ہوا جنہوں نے انگریزی انشایئے کو نہ صرف نقطہء کمال پر پہنچادیا بلکہ اس میں لذت انگیزی کا زاویہ بھی پیدا کر دیا۔ "ایڈیسن" اور "سٹیل" نے زندگی کے عام معمولات اور معاشرے کے سادہ موضوعات پر اپنے مخصوص اور انوکھے انداز میں قلم اٹھایا۔ "سٹیل" اور "ایڈیسن" ایک ہی عہد کے انشائیہ نگار تھے اور یہ دونوں "ٹیٹلر"، "سپیکٹیٹر" اور "گارڈین" وغیرہ اخبارات میں باقاعدگی سے لکھتے تھے۔

"ڈاکٹر جانسن" اپنے عہد کے ادب کی ایک موثر ترین شخصیت تھے وہ فطری انشائیہ نگار بھی تھے لیکن اس سے کہیں زیادہ ایک اچھے نقاد تھے۔ ڈاکٹر جانسن کی انشائیہ نگاری اگرچہ "ایڈیسن" اور "سٹیل" کے سلسلے کی توسیع ہے تاہم وہ زندگی پر ایک ضبط نظر ڈالنے اور ایسے حقائق جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے جن سے بنی نوع انسان کو مناسب رہنمائی مل سکے۔ وہ ادیب سے زیادہ ایک مصلح کا روپ اختیار کرتا ہے اور اپنی بیشتر تحریروں میں معاشرے کے خس وخاشاک کو صاف کرنے میں نظر آتا ہے۔ "ایڈیسن" اور "سٹیل" کے بعد Essay کے ضمن میں "گولڈ سمتھ" کو اہمیت حاصل ہے۔ جب ۱۷۵۹ء میں اس نے "BEE" کی ادارت سنبھالی اور اس میں اس کے Essays چھپنے شروع ہوئے تو جلد ہی اپنے لیے قارئین کا ایک حلقہ پیدا کر لیا۔

انگریزی Essay کی تاریخ میں "گولڈ سمتھ" کے بعد "لی نیٹ"، "ولیم ہیزلٹ" اور "چارلس لیمب" کے نام نمایاں اہمیت رکھتے ہیں۔ انگریزی انشائیہ کی حیاتِ نوع انہی انشائیہ نگاروں کی مرہونِ منت ہے۔ "آرایل سیٹونسن" نے "ہیزلٹ" کو اپنا استاد کہا ہے چنانچہ ان دونوں کی انشائیہ نگاری میں بہت سی قدریں مشترک ملتی ہیں "ای وی ٹوکس" کے انشائیوں میں حال ماضی کی طرف مراجعت کا انداز نمایاں ہے۔ اس کے بعد انگریزی انشایئے کی تاریخ میں "رابرٹ لینڈ" کا نام آتا ہے اور پھر "جے۔بی"، "پریسٹلے" سامنے آتے ہیں۔ "پریسٹلے" نے اپنے انشائیوں کا مجموعہ "Delight" پیش کیا۔ "ورجینا وولف" نے داخلی نشاط کو عالمانہ بصیرت سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ "ہیئر بیلاک" کے انشائیوں میں قولِ محال کو قطعیت سے پیش کرنے کا رجحان ایک غالب حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے انشائیوں میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ شگفتگی بھی نظر آتی ہے۔ "مونیتن" نے انشایئے میں انکشافِ ذات کو سب سے زیادہ اہمیت دی تھی۔ "چارلس لیمب" کے بعد انشایئے کے اس اہم عنصر سے اغماض برتا جانے لگا تھا۔ "میکس بیر بہوم" کی خوبی یہ ہے کہ اس نے انشایئے میں اس عنصر کی تجدید کی احد انشائیہ کو ایک دفعہ پھر ابلاغِ ذات کا مظہر بنادیا۔

انگریزی ادب میں انشائیے کا ارتقاء قریباً چار صدیوں پر پھیلا ہوا ہے اس تمام عرصے میں نہ صرف انشائیے کے داخلی نظام میں متعدد تبدیلیاں لائی گئیں بلکہ اس کے مزاج نے بھی جزرومد کے کئی مراحل طے کیے چناچہ "مونیتنؔ" نے اسلوب کی پختہ کاری اور ندرت کو ابلاغِ ذات کا وسیلہ بنایا تھا لیکن "بیکنؔ" نے اپنے "خیالاتِ پریشان" میں بلند مطالب اور عمیق تصورات سمونے کی کوشش کی۔"ابراہم کاؤلے" نے انشائیے کو دوبارہ داخل کی سیاحت پر آمادہ کیا لیکن "ایڈیسن" اور "سٹیل" کے عہد میں انشائیے نے روزمرہ کے معمولی مسائل و مشاہدے کے اظہار پر قدرت حاصل کر لی۔اس دور میں انگریزی صحافت نے انشائیے کا خیر مقدم کھلے انداز سے کیا۔چنانچہ "ایڈیسنؔ" اور "سٹیل" کے بعد انگریزی زبان و ادب کے بیشتر انشائیہ نگار اخبارات و رسائل سے نمایاں ہوئے۔اس دور میں انگریزی انشائیے کو موضوعات کا تنوع،اسلوب کی تازگی،اظہار کی ندرت اور ابلاغ کی بوقلمونی حاصل ہوئی۔

انشائیہ بیسویں صدی کے خمسِ اول میں اپنے انتہائی عروج پر آنا شروع ہوا۔اس دور میں "چرٹنؔ"، "ورجینا"، "وولف"، "پریسٹلے"، "لوکسؔ"،"بیر بہومؔ"،"رابرٹؔ لینڈ" وغیرہ نے انشائیے لکھے۔چناچہ انشائیے کا اوج صرف انیسویں صدی تک محدود نہیں،بلکہ اس کا سلسلہ بیسویں صدی تک پھیلا ہوا ہے۔اس دور میں "لٹن سٹریچے"،"ورجیناوولف"،"ڈی ایچ لارنس"،"آلڈس لکیلے"،"جیمز تھربر"، "جارج آروپل"،"گرہم گرین"،"مارک ٹوین"،"گلرٹ یائیٹ" اور "ای بی وائیٹ" جیسے انشائیہ نگار منظرِ عام پر آئے۔ جنہوں نے انشائیہ کے وسیلہ سے فرد پر ایک نیا جہانِ معنی منکشف کرنے میں کامیابی حاصل کی۔مغربی ادب میں انشائیے کی جو روایت "مونیتنؔ" سے شروع ہوئی تھی وہ مرورِ ایام کے ساتھ مردہ نہیں ہوئی بلکہ نئی صورت اور صحت مند تبدیلیوں کے ساتھ یہ روایت آئندہ نسلوں کو منتقل ہوتی رہی ہے اس لیے یہ صنف تجدید روایت کے ساتھ زندہ ہے بل کہ اب تیسری دنیا کے ادب میں بھی نمو پذیر ہے اور بیسویں صدی کے چھٹے عشرے میں پاکستان کی قومی زبان اردو میں اس صنف کا تیز تر فروغ اور بطور تحریک اس کی پیش قدمی اس حقیقت کا ہی ایک ثبوت ہے۔

اُردو انشائیے کا پسِ منظر:

بر صغیر پاک و ہند میں انشائیے کی افزائش ادیب کی داخلی تحریک کا نتیجہ نہیں بلکہ بہت سے ناقدین نے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ انشائیہ کی صنف مغرب سے ہمارے ہاں آئی اور "سر سید احمد خان" اسے اردو ادب سے باقاعدہ طور پر متعارف کرانے والے پہلے ادیب تھے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے لکھا ہے کہ:

> اُردو ادبیات میں "مضمون نگاری" انگریزی ادبیات کے زیرِ اثر انیسویں صدی میں شروع ہوئی اور سر سید احمد خان اردو میں اس صنف ادب کے باقاعدہ آغاز کرنے والے تھے۔ (۷)

"ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار" کی طرح "ڈاکٹر وحید قریشی" بھی انشائیے کے ضمن مغربی رجحانات کو دیکھتے ہیں اور انشائیے کا رشتہ مغرب سے جوڑتے ہیں۔ اسی طرح "نظیرِ صدیقی" نے بھی سر سید کو ہی اردو کا پہلا انشائیہ نگار تسلیم کیا ہے۔

اردو انشائیے کے بارے میں ان تمام آراء سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اردو ادب میں انشائیہ کی صنف کا باقاعدہ آغاز "سر سید احمد خان" سے ہوتا ہے تاہم اس سے بعض ناقدین نے اختلاف بھی کیا ہے اور کچھ محققین نے اس کا سراغ قدیم اردو نثر میں بھی لگایا ہے۔ جیسے کہ "ڈاکٹر جاوید وشٹ" نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اردو انشائیہ کی ابتدا قطب شاہی دربار کے پہلے تاریخی ادبی معرکے سے ہوئی یہ معرکہ "مُلا دجہیؔ" اور "ملا غواصی" کے مابین کم و بیش تیس سال تک جاری رہا۔ ملا وجہیؔ کی طبع ذار مثنوی "قطب مشتری" سے اس معرکے کا آغاز ہوا۔ سب رس اس کا نقطہ عروج بھی تھا اور خاتمہ بھی۔ لیکن انور سدید کہتے ہیں کہ "ملا وجہیؔ" کی کتاب "سب رس" اردو زبان کے دور طفولیت کی کتاب ہے اور اس زبان کو ابھی قدرتِ کمال حاصل نہیں ہوئی تھی۔ "ملا وجہیؔ" جذبات کے اظہار کو وسعت دینے کے لیے تکرار بے جا اور ارادی قافیہ ہیمائی کا شکار ہے۔ وہ مطالب کو الفاظ کی کفایت سے پیش کرنے کے بجائے معنی کی اکائی پر مترادف الفاظ کے انبار لاد دیتے ہیں۔ اسی طرح "حافظ محمود شیرانی" نے بھی "سب رس" کے اسلوب کو دقیق اور مقفیٰ و مسجع سے مزین اسلوب قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس قسم کا بوجھل اور مصنوعی اسلوب انشائیہ کے فطری مزاج کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ ملا وجہی کا انداز غیر معروضی ہے۔ اور مولوی عبد الحق کہتے ہیں کہ ملا وجہی نے جگہ جگہ ہندو موعظمت کا استعمال کیا ہے اور کہیں تصوف کا اسرار جو اَب معمولی باتیں ہو گئی ہیں بیان کیے ہیں۔

"ڈاکٹر جاوید وشٹر" نے "ملا وجہیؔ" کی جن تحریروں کو انشائیہ کی ذیل میں جمع کیا ہے "مولوی عبدالحق" نے انہیں "سب رس" کے غیر متعلقہ مباحث قرار دیا ہے۔ تاہم انہی وجوہ کی بناء پر انشائیہ قرار دینا قرین انصاف نہیں۔ یہ ٹکڑے جو اور بے جوڑ نظر آتے ہیں۔ انشائیہ کی فنی متقیضات اور محاسن پر پورے نہیں اُترتے۔ سب رس چونکہ فتاحی کیتاب "حسن و دل" کا آزاد ترجمہ کیا ہے اس لیے اس میں وجہی کے اسلوب کی بعض رعنائیاں بھی درآئی ہیں۔

"سب رس" اس کو اس کے رنگین اسلوب نے ہی تاریخی حیثیت دی ہے اور اس کتاب کے خدوخال سے انشائیہ کا پیکر تراشنا ممکن نظر نہیں آتا۔ "مولوی عبدالحق" نے ان ٹکڑوں کو غیر متعلق مباغث شاید تفننِ طبع کے لیے کہا تھا لیکن "ڈاکٹر جاوید وشٹ" نے اسے سنجیدگی سے قبول کر لیا اور وجہی کو باقاعدہ انشائیہ نگار قرار دے دیا۔ اس کے برعکس "ڈاکٹر سید جعفر" نے انہیں انشائیہ نما تحریریں تو تسلیم کیا ہے لیکن ان کی جداگانہ حیثیت کو قبول نہیں کیا۔ اور "انور سدید" کی رائے "وجہیؔ" کو انشائیہ نگار قرار دینا محض ایجادِ بندہ ہے اور "سب رس" کے غیر متعلق مباحث انشائیہ کے فنی مدار سے خارج نظر آتے ہیں۔

قدیم اُردو نثر میں انشائیہ کی ابتدا کے سلسلہ میں ایک اور اہم شخصیت "ماسٹر رام چندر" کی ہے۔ "ماسٹر رام چندر" فورٹ ولیم کالج اور سائنٹیفک سوسائٹی کی درمیانی کڑی یعنی قدیم دلی کالج کے نامور اساتذہ میں سے تھے۔ انہوں نے 1845ء میں رسالہ "فوائد " نکالا۔ ماسٹر رام چندر کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے اُردو کا پہلا علمی و ادبی ماہنامہ "خیر خواہ ہند" جاری کیا جو بعد میں "محبِ ہند" کے نام سے موسوم ہوا۔ اس رسالہ میں اصلاحی، اخلاقی معاشی اور سائنسی مضامین کی اشاعت کو بالخصوص اہمیت دی گئی۔ اس رسالہ سے ہی ماسٹر رام چندر ایک مضمون نگار کی منفرد حیثیت میں سامنے آئے۔ رسالہ سپیکٹیٹر اور ٹیٹلر وغیرہ نے لندن کی تہذیبی زندگی میں جو انقلاب بپا کیا تھا، ماسٹر رام چندر اس سے بخوبی واقف تھے۔ اور ایک ادبی صحافی کی حیثیت سے وہ سپیکٹیٹر کے انداز میں کام کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔

ناقدین نے ماسٹر رام چند کو ایک ایسا ادیب شمار کیا ہے جس نے اُردو نثر کو انقلابی کروٹ دینے کی کوشش کی لیکن انہیں انشائیہ نگاروں کی صف میں شامل نہیں کیا۔ بالفاظ دیگر جس نوع کی مضمون نگاری کو سرسید نے شعوری طور پر رائج کرنے کی کاوش کی تھی اس کی تقویم کا سہرا ماسٹر رام چندر کے سر سجتا ہے۔

اس دور کا ایک اور اہم نثر نگار جس پر ایک انشائیہ نگار کا گمان بھی ہو سکتا ہے مرزا غالبؔ ہیں۔ غالبؔ نے اپنے نجی خطوط میں مراسلے میں مکالمے کا انداز اختیار کیا اور مصنوعی اور آرائشی نثر کو بالائے طاق رکھ کر

بے تکلف اور سادہ انداز میں انکشاف ذات کا ایک نیا اسلوب وضع کر ڈالا۔ غالبؔ کے سامنے سر سید احمد خان یا ماسٹر رام چندر کی طرح کوئی واضح قومی نصب العین نہیں تھا۔ خطوطِ غالب میں ایک ایسی انجمن آراستہ نظر آتی ہے جس میں غالبؔ اپنے دوستوں سے محوِ کلام ہے اور تکلیف کا کوئی دادہ ان کے درمیان حائل نظر نہیں آتا۔

ناقدین کی نظر میں جس اسلوبِ نگارش کی توقع ایک انشائیہ نگار سے کی جاسکتی ہے وہ یقیناً غالبؔ کے ہاں موجود ہے ان کی نثر میں انتہائی مزاح موجود ہے، لیکن موضوع کی عدم موجودگی اور ذات کے صرف نجی اور غیر ادبی گوشوں کی نقاب کشائی کی بناء پر اسے انشائیہ نگار تسلیم نہیں کیا گیا۔ غالبؔ کی مکالمت اتنی نجی ہے کہ یہ انشائیہ کے مدار میں داخل نہیں ہوتی۔ ان کے اپنے زندہ اسلوب اور بے تکلف اظہارِ بیان کے باوصف غالبؔ کو انشائیہ نگار قرار دینا ممکن نہیں۔ اس سب کے باوجود غالبؔ کی اس عطا سے انکار ممکن نہیں کہ انہوں نے ماسٹر روم چند اکے عہد کی غیر تخلیقی نثر کو ادبی اسلوب عطا کیا اور مستقبل کی نثر کے لیے بالعموم اور انشائیہ کے فن کے لیے بالخصوص تخلیقی نثر کے چند عمدہ نمونے فراہم کر دیے۔

اس تمام بحث سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جن محققین نے انشائیہ کا سراغ قدیم نثر میں لگایا ہے انہوں نے جزو کو کل پر فوقیت دینے کی کاوش کیں اور اپنے فیصلے کی اساس انشائیہ کی بعض منتشر اور غیر مرتب صورتوں پر رکھی۔ مثال کے طور پر اسلوب کی روح پر شگفتگی "میر امن" کی "باغ و بہار ہیں۔ اور رجب علی بیگ سرور کے "فسانہ عجائب" میں بھی موجود ہے۔ اور یہ انشائیہ کے مزاج کے ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ غیر رسمی انداز اور عدم تکمیل کی خوبی مرزا غالبؔ کے خطوط میں بدرجہ اتم ملتی ہے۔ اور یہ انشائیہ کی بنیادی صفات میں سے ہیں۔ تاہم واضح رہے کہ ان ادبا کے سامنے مغربی انشائیہ کے مثالی نمونے موجود نہیں تھے۔ چناچہ اگر انشائیہ کے کچھ عناصر لاشعوری طور پر ان کی نثر میں درآئے ہیں تو یہ اس صنف کی منضبط اور باقاعدہ ابتدا کی نشاندہی نہیں کرتے بلکہ محض اتفاقی ہیں۔ اس کے برعکس سر سید نے مضمون نگاری کا آغاز شعوری طور پر کیا اور اس کے ساتھ اخلاقی تو خوش طبعی سے جِلا دینے اور خوش طبعی کو اخلاق سے زندہ کرنے کا مقصد بھی وابستہ کیا اور یہ وہی مقصد تھا جو ایڈیسنؔ اور سٹیل کے پیشِ نظر تھا۔

"سر سید" خود کو منکشف کرنے کے بجائے قاری کی ضرورت کو پیشِ نظر رکھتے ہیں اور ان کے بیشتر مضامین ملک و قوم کی اخلاقی، مذہبی، تعلیمی، سماجی اور قومی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ سر سید کے اس قسم کے مضامین میں تعصب، طریقہء زندگی، تعلیم و تربیت، اپنی مدد آپ، کاہلی، عورتوں کے حقوق، بحث ناسخ و منسوخ وغیرہ شامل ہیں اور یہ انشائیہ کے وسیع تر مفہوم کے ساتھ بھی مطابقت نہیں رکھتے۔ ان مضامین میں سر سید کا

استدلال علمی، بحث کا اندازِ منطقی، محاکمہ منضبط اور اظہار کا انداز تعلیمی ہے۔اس کے برعکس گزرا ہوا زمانہ، امید، سرابِ حیات اور بحث و تکرار وغیرہ مضامین میں انشائیے کے بعض محاسن نظر آجاتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں کہ:

> سرسید کے بعض مضامین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہم انہیں انشائیہ کے تحت شمار کر سکتے ہیں لیکن میری دانست میں ایسا کرنا درست نہیں کیونکہ سرسید کے بیشتر مضامین میں ایک تو سنجیدہ مباحث کا انداز ملتا ہے جو انشائیہ میں نہیں ہونا چاہیے۔دوسرے اندازِ بیان میں شگفتگی نہیں جو انشائیہ کا بنیادی وصف ہے۔تیسرے ان مضامین میں سرسید نے اپنی ذات کے کسی نامعلوم گوشے کو عریاں کرنے کی بجائے خارجی زندگی کے واقعات اور مسائل کو نمایاں کیا ہے۔ (۸)

اس اقتباس کو مدِ نظر رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ "ڈاکٹر وزیر آغا" سرسید کو پہلا باقاعدہ انشائیہ نگار تسلیم کرتے اور ان کے مضامین کو انشائیے کے طور پر قبول نہیں کرتے اس سلسلے میں وہ تین ایسی صفات بیان کرتے ہیں جو سرسید کے مضامین میں نظر نہیں آتی۔"عارف عبدالمتین" نے بھی سرسید کے مضامین کو سائنس آمیز اصلاحی نثر پاروں میں شمار کیا ہے۔اسی طرح اردو مضامین کے ایک مرتب "ڈاکٹر محمد حسنین" انشائیہ کی ابتدا "محمد حسین آزاد" سے منسوب کرتے ہیں اور انہوں نے اپنی فہرست میں سرسید کو شامل ہی نہیں کیا۔

مندرجہ بالا تمام توضیحات کی روشنی میں یہ کہنا درست ہے کہ سرسید کی تخلیقات اس صنف کے آغاز کی طرف راہنمائی کرتی ہیں لیکن انہیں انشائیہ قرار دینا مشکل ہے۔

ان تمام باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ "سرسید احمد خان" نے "ایڈیسن" اور "سٹیل" کی تقلید میں جو، مضامین سپردِ قلم کیے وہ ان کی دانست میں وہ انشائیے ہی تھے لیکن ان کے پیشِ نظر کسی نئی صنفِ ادب کا تعارف وار تقاء نہیں تھا۔ایک مصلح قوم کی حیثیت میں انہوں نے مضمون گاری کو پند و نصائح کی ترسیل کا وسیلہ بنایا اور ایک بڑے حلقے کو متاثر کیا۔اس دور کے متعدد دوسرے ادبا بھی مغربی Essay سے متعارف ہو چکے تھے۔سرسید کی مضمون نگاری نے انہیں بھی Essay کی راہ پر چلنے کی ترغیب دی چناچہ مضمون نگاروں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی جس نے اس صنف میں اپنے اپنے انداز میں طبع آزمائی کی۔

عہدِ سرسید کی انشائیہ نگاری:

"سرسید احمد خان" کا حلقہء اثر بہت وسیع تھا۔ وہ اپنے احباب کو جن کی علمی دوستی نے اس دور کے اندھیروں کو روشنی سے متعارف کریا۔ "تہذیب الاخلاق" میں مضمون لکھنے کی دعوت دیتے رہتے تھے چناچہ ان کی تقلید میں ادیبوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جس نے عقل و فرد کی کارگزاریوں کے پہلو بہ پہلو تخیل کو آزادانہ پرواز کی دعوت بھی دی۔ عہد سرسید کی انشائیہ نگاری اپنی صاحبِ اسلوب ادبا کی قلمی کاوشوں سے عبارت ہے اور یہ تحریریں وہ بنیادی پتھر ہیں جن پر بیسویں صدی میں انشائیہ کا قمر تعمیر کیا گیا۔

عہدِ سرسید کے مضمون نگاروں میں سے "محمد حسین آزاد" کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ آزاد کے مضامین خوش بیانی کے مرقعے اور لفظی مصوری کے پُر کیف اور نادر کار نمونے ہیں۔ "نیرنگِ خیال" کے مضامین مثلاً گلشنِ امید کی بہار، انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا، خوش طبعی اور نکتہ چینی وغیرہ میں انشائیے کا مزاج ایک حد تک موجود ہے۔ ان مضامین میں اختصار بھی ہے اور جامعت بھی اور اسلوب بھی سحر انگیز ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آزاد کے یہ انشائیے ان کے اپنے ذہن کی تخلیقی رانگ سے نہیں اُبھرے بلکہ یہ ڈاکٹر جانسنؔ، ایڈیسنؔ اور رسالہ سپکٹیٹر کے بعض مضامین کے آزاد ترجیح ہیں۔ محمد حسین آزاد نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ میں نے انگریزی انشائیہ نگاروں کے خیالات سے اکثر چراغِ شوق روشن کیا ہے۔ بلاشبہ آزاد نے تراجم و استفادہ کے اس عمل میں اپنی مشرقیت کو برقرار رکھا لیکن انہیں تخلیقی انشائیہ نگار تسلیم کرنا ممکن نہیں۔

علی گڑھ تحریک میں "ذکاءاللہ دہلوی" کی حیثیت اس محنت کش کی ہے جس نے صلہ وستائش کی پروا کیے بغیر ہزاروں صفحات لکھ ڈالے۔ قدیم دلی کالج میں ان کی تربیت امام بخش صہبائی اور ماسٹر رام چندر نے کی تھی۔ سرسید کے معاون کی حیثیت میں انہوں نے علی گڑھ میں مجوزہ کالج اور سائنٹیفک سوسائٹی کے قیام میں گرانقدر خدمات سرانجام دیں اور بعض ناقدین نے تو یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ سرسید تو انگریزی کتابوں کے تراجم شائع کرنے کا مشورہ بھی مولوی ذکاءاللہ نے ہی دیا تھا۔ اس کا غالبؔ موضوع انسانی اخلاقیات تھا اور انہوں نے مشرق و مغرب کی کتبِ مفیدہ سے بڑی فراوانی سے استفادہ کیا۔ ان کے ہاں کہیں کہیں انشائیہ کے جزوی نمونے بھی مل جاتے ہیں اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ذکاءاللہ کے ہاں اس قسم کے مضامین کے اسلوب کی تازہ کاری بھی ملتی ہے اور بعض اوقات تو یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے موضوع کو مَس ہی

نہیں کیا بلکہ اسے ایک نئے مدار میں داخل ہونے کا موقع بھی دیا ہے۔ مولوی ذکاءاللہ کا بیشتر کام چونکہ ترجمہ و استفادہ پر مبنی ہے اس لیے سوانح نگاروں کو مولوی صاحب کے تصنیفی کام میں افکار، عالیہ کی چمکدار روشنی کم نظر آئی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں انشائیہ ابھر نہیں سکا۔

وحید الدین سلیم کے مضامین میں غواصی کا عمل نمایاں ہے۔ان کے مضامین "تنہائی کے فوائد" اور "دوستوں کی ایذا رسائی" میں موضوعات کے مخفی مفاہیم کو اجاگر کرنے کی کاوش بھی نظر آتی ہے۔ ہر چند وحید الدین سلیمؔ نے بھی بیشتر اصلاحی جذبے کے تحت قاری کو بلاواسطہ طور پر مخاطب کیا ہے تاہم انہوں شعور کو مہمیز لگانے اور حقیقت کا نیا رُخ دکھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ اور اس میں وہ خاصے کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس عہد کے بیشتر ادبا "Essay" کے اصطلاحی مفہوم سے آشنا نظر آتے ہیں لیکن اس صنف کے مزاج کو اپنے تخلیقی عمل میں شامل کرنے پر قادر نہیں اور ان کی سطح اپنے موضوع پر لکھے گئے "جواب مضمون" سے زیادہ بلند نہیں ہو سکی۔ نتجہ یہ ہوا کہ لطیف موضوع بھی بعض اوقات خطابت اور للکار کی نذر ہو گیا۔ مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری کی اس موثر اور معنی خیز ابتدا نے جب بیسویں صدی کی طرف پیش قدمی کی تو اس کی داخلی قوتِ نمو نے لرزتی، ڈولتی کیفیات کو پکڑنے کی کوشش کی۔ چناچہ اردو انشائیہ کا اب جو روپ سامنے آیا ہے اس پر انشائے لطیف کا غلبہ نمایا تھا۔

بیسویں صدی میں انشائیہ کی پیش قدمی:

"آغا شاعر قزلباش" کے مضامین میں فطرت کو اپنے اوپر نچھاور کرنے کا جذبہ موجود ہے لیکن وہ کسی نئی حقیقت کو جنم دینے کے بجائے موجود حقیقت کے اثبات میں زیادہ کوشاں نظر آتے ہیں۔ آغا شاعر کا شاعرانہ مزاج انشائیہ کے بہت قریب نظر آتا ہے اور وہ حقیقت کو ایک مخلص تخلیق کار کی نظر سے دیکھتے ہیں اور زیادہ تر مشاہدے کے فنکارانہ بیان پر اکتفا کیا ہے۔ "میر ناصر علی" کے مضامین کی اولین خوبی ان کی زندہ اور خیال افروز نثر ہے۔ اس نثر میں دلی کی جھلکیاں ہی نظر نہیں آتیں بلکہ وہ اجتماعی شخصیت بھی موجود ہے جو تہذیبوں کو اتھل پتھل میں معدوم ہو گئی تھی۔ "میر ناصر علی" اپنی شگفتہ بیانی سے قاری کے دل میں اترنے کا سلیقہ جانتے تھے۔ "میر ناصر علی" کے اس قسم کے مضامین میں انشائی مزاج اور انشائیہ کا جوہر موجود نظر آتا ہے لیکن میر ناصر نے اس قسم کی آزادہ روی کو بالعموم اپنی صحافتی ضرورتوں کے سامنے پوری توانائی سے پروان نہیں چڑھنے دیا۔

"شیخ عبد القادر" نے ایک تخلیقی ادیب سے زیادہ غمخوارِ قوم کا فریضہ انجام دیا۔ وہ انگریزی زبان و ادب اور تہذیب کے دیرینہ ناظر اور انشائیہ کے داخلی مزاج سے آشنا تھے۔ مثال کے طور پر ان کا مضمون "بے سروسامانی" خالصتاً انشائیہ کا موضوع ہے اور اس کے داخل میں متعدد انوکھے پہلو موجود ہیں لیکن ایک غمخوارِ قوم کی حیثیت میں "شیخ عبد القادر" نے اسے سنجیدہ بحث و نظر کا موضوع بنادیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ عبد القادر کی انشائیہ نگاری کی خوبیاں ابھر نہ سکیں۔ شیخ عبد القادر کی سب سے بڑی عطایہ ہے کہ انہوں نے مخزن کے صفحات سے متعدد خوش فکر ادبا کو ابھرنے کا موقع دیا اور زبان و ادب کی انشائی خوبیوں کو پروان چڑھانے میں گرانقدر حصہ لیا۔

"سجاد حیدر یلدرمؔ" نے ادب میں عملہً قدم رکھا تو اس روشن خیال نسل میں شمار ہوئے جسے مغربی تعلیم نے کچھ نئے آدرش دیے تھے۔ سجاد حیدر یلدرمؔ کے مضامین اور انسانوں میں اس آدرش کے حصول کی توانا آرزو بے حد نمایاں ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے یلدرمؔ کو سرسید کے بعد کے دور کے ان اہلِ قلم میں شمار کیا ہے جو انشائیہ نویسی کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اور ان کے مضمون "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" کو بالیقین انشائیہ تسلیم کیا ہے لیکن یلدرمؔ نے اسے ترجمہ کر کے انشائیہ نگاروں کی ابتدائی فہرست سے خود یہ بے دخل کر دیا تاہم انشائیہ نگار کا مزاج اور صلاحیت رکھنے کے باوجود یلدرمؔ کو صاحبِ اسلوب انشائیہ نگاروں میں ہی فضیلت کا مقام عطا کیا گیا ہے۔

ابو الکلام آزاد کی تصنیف "غبارِ خاطر" کی تحریروں کو ایسی تحریروں میں شمار کیا جاتا ہے جو انشائیہ نگاری کے اعلیٰ ترین نمونے قرار دیے جاسکتے ہیں۔ ان خطوط میں ابو الکلام آزاد کا ردِ عمل شخصی ہے اور وہ زندگی کی گھمبیر اور پُر اسرار سنجیدگی کا پردہ چاک کر دیتے ہیں۔ انشائیے کی یہ صورت "چڑیا چڑے کی کہانی" اور "چائے" کے بارے میں تاثرات میں پیش کی گئی ہے۔ اور یہ مسرت کی ایک خاص نوع کو جنم دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ابو الکلام آزادؔ نے انشائیہ کی صنف کو شعوری طور پر قبول نہیں کیا اور نہ اپنے اس مخصوص انداز کو مزید وسعت دی۔ چناچہ اب اس صنف کی تاریخ میں ابو الکلام کو ایک مقام حاصل ہے تو بس اتنا کہ اس صنف کی طرف انہوں نے جزوی اور غیر شعوری طور پر پیش قدمی کی اور انشائیہ کے چند ٹکڑے ان کی تخلیقی نثر میں ارتقائی طور پر شامل ہو گئے۔

"خواجہ حسن نظامی" نے اپنے مضامین میں بالعموم زندگی کے معمولی اور غیر اہم موضوعات پر تازگی، جدت اور تنوع سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کے مضامین میں افتار بھی ہے اور جامعیت بھی۔" جھینگر کا

جنازہ"، "دستِ پناہ"، "دیا سلائی"، "آنسو کی سرگزشتہ" اور "اُلو" وغیرہ ان کے چند ایسے عنوانات ہیں جن کے گرد ایک اچھے انشائیے کا تارو پود بنا جا سکتا ہے۔

ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ "خواجہ حسن نظامی" کا مزاج انشائیہ کے مزاج سے بڑی حد تک مطابقت رکھتا ہے لیکن وہ رعایتِ لفظی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اکثر اوقات الفاظ کی بازی گری میں مبتلا ہو جاتے ہیں چناچہ انشائیہ کے کچھ بکھرے ہوئے ٹکڑے ان کے مضامین میں بھی موجود ہیں لیکن ان کی شخصیت اور مضامین میں سے ایک مکمل انشائیہ نگار سامنے نہیں آتا۔

فرحت اللہ بیگ کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے کہ:

> فرحت اللہ بیگ کے ہاں وہ بہت سی باتیں ملتی ہیں جو انشائیہ کا بنیادی وصف قرار پا چکی ہیں، مثلاً شگفتہ اندازِ نگارش او موضوع سے مصنف کا گہر تعلق، لیکن یہ حقیقت ہے کہ فرحت اللہ بیگ کے ہاں بھی دوسرے کرداروں کی عکاسی یا واقعات کا بیان ہی انشاء کا باعث ترین عنصر ہے اور اسی لیے وہ بھی اپنی ذات کے کسی گوشے کو عریاں نہیں کر سکے۔ (۹)

اس کی سب سے نمائندہ مثالیں "فرحت اللہ بیگ" کے مضامین "پھول والوں کی سیر" اور "دلی کا یاد گار مشاعرہ" سے فراہم ہوتی ہیں۔ ان مضامین میں "فرحت اللہ بیگ" نے قاری کو پھولوں کے میلے کی اور دلی کے ایک یاد گار مشاعرے کی سیر کرادی ہے۔ مرزا فرحت اللہ کے متعدد ایسے مضامین ہیں جن میں انشائیہ بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے اور ان کی منفرد شگفتہ نگاری کا زاویہ ابھار دیتی ہے۔ کرشن چندر کے ہاں انشائیہ نگاری کی فطری صلاحیت موجود ہے۔ وہ مجرد اور عام باتوں کو غیر معمولی انداز میں پیش کرنے کا فن جانتے تھے۔ چناچہ طنز و مزاح کی فراوانی کے باوجود ان کے مضامین میں ایسی خصوصیات موجود ہیں جس میں انشائیہ کے مزاج کا شائبہ نظر آتا ہے۔

اس اجمالی جائزہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ برِ صغیر کی آزادی سے قبل اردو ادب میں انشائیہ ایک علیحدہ اور مکمل صنفِ ادب کے طور پر موجود نہیں تھا۔ انشائیہ کی طرف بعض ادب نے انفرادی طور عر پر پیش قدمی ضرور کی لیکن ان میں سے کوئی ایک ادیب بھی انشائیہ کے مزاج اور مقتفیات کو پوری طرح گرفت میں لینے یا اس کے سب محاسن کو فن پارے میں سمونے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ انشائیہ لکھنا اس عہد کے ادبا کے اظہار کی علیحدہ جہت اور تخلیقی عمل کی منفرد صنف نظر نہیں آتی۔ ابتدا ان ادبا کے

طنزیہ، مزاحیہ، علمی یا فکری مضامین میں انشائیہ کا مزاج جزوی طور پر یا انشائیہ کے ٹکڑے منتشر صورت میں نظر آجاتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو اس صنف کی عرف ۱۹۵۵ء کے بعد خصوصی توجہ دی گئی۔

انشائیے کا عبوری دور:

آزادی کے بعد انشائیہ کا مزاج بتدریج نکھر کر سامنے آنے لگا اور چند ایک ادبا نے مضمون نگاری کے روایتی خول کو توڑ کر انشائیہ کے مزاج سے ہم آہنگی پیدا کی اور نہ صرف لطیف کیفیات کو جنم دیا بلکہ اشیاء، مظاہر اور تصورات کی تہوں کو کھنگال کر ان سے مفاہیم کے نئے زاویے بھی تراش لیے۔ اس قسم کے نقوش کی اولین جھلک اس دور کے ایک نئے ادیب نصیر آغا کے مضمون "بہار کی ایک شام" میں ملتی ہے جو "ادبی دنیا" کے بہار نمبر (اپریل ۱۹۴۹ء) میں شائع ہوا۔ خیال کی ترنگ، موضوع کی تازہ کاری، اسلوب کی رعنائی، خیال کی ندرت، حقیقت کو ایک نئے مدار میں ڈالنے کا انداز، اور ایجاز و اختصار کے ساتھ مفاہیم کی وسعت کی بناء پر ان کے مضامین انشائیے کے فطری مزاج سے مماثلت رکھتے ہیں۔ ان تمام محاسن کی بنا پر یہ کہنا بجا ہے کہ اردو کا پہلا مکمل انشائیہ "بہار کی ایک شام" کی صورت میں معرض وجود میں آیا تھا۔

اپریل ۱۹۴۹ء میں "ادبی دنیا" میں نصیر آغا کے انشائیے کی تخلیق منظرِ عام پر آئی تو اس کے اگلے ماہ ہی "ادبی دنیا" میں "ڈاکٹر داؤد رہبر" کا مضمون "لمحے" شائع ہوا تو اس کی پذیرائی بھی اسی والہانہ انداز میں ہوئی جیسے نصیر آغا کے مضمون "بہار کی ایک شام" کی ہوئی تھی۔ داؤد رہبر نہ صرف انشائیے کے مزاج کو سمجھتے تھے بل کہ اسے تخلیقی پیکر میں ڈھالنے کا سلیقہ بھی رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے مضمون "لمحے" کو اس صنف کا دوسرا نمائندہ انشائیہ قرار دینا درست ہے۔ اس دور میں خالص انشائیہ کے نقوش متعدد دوسرے ادبا کی تخلیق پاروں میں بھی بکھرے ہوئے ملتے ہیں مثال کے طور پر غلام علی چودھری اردو ادب میں ایک افسانہ نگار کے طور پر متعارف ہوئے تھے اور انہوں نے انشائیہ لکھنے کی شعوری کاوش کبھی نہیں کی۔ لیکن ان کے مضمون "ہر جائی" میں انشائیہ کے بہت سے نقوش موجود ہیں۔ غلام علی چودھری نے اس مضمون کا مواد معاشرتی زندگی سے سمیٹا ہے۔

اردو انشائیہ کا متذکرہ بالا دور اگرچہ کچھ زیادہ طویل نہیں لیکن اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے انشائیہ کے زریں دور کو قریب تر لانے اور انشائیہ کے لیے نام کی تلاش کی راہ ہموار کی۔ اس عبوری دور میں ہمیں خالص انشائیہ کے خال خال نمونے بھی نظر آتے ہیں۔ اس دور میں انشائیہ کی طرف "داؤد رہبر"، "جاوید

صدیقی"، "غلام علی چودھری"، "ممتاز مفتی"، "حسنین کاظمی" اور "امجد حسین" نے غیر شعوری طور پر پیش قدمی کی۔ لیکن جب "وزیر آغا" کا دور آیا تو انہوں نے انشائیہ کو اپنے تخلیقی اظہار کے ایک اہم وسیلے کے طور پر بھی قبول کیا چنانچہ وزیر آغا کا دور جسے اردو انشائیے کا دورِ جدید کہا جاتا ہے اس میں نہ صرف انشائیے کے خدوخال واضح ہوئے بلکہ اس کی پہچان کا مسئلہ بھی پیدا ہوا۔ اور انشائیہ نگاروں کی ایک ایسی جماعت بھی سامنے آئی جس کے نزدیک انشائیہ اردو ادب کی ایک علیحدہ اور بامعنی صنف تھی۔

انشائیے کا دورِ زریں:

اس دور میں جو انشائیہ نگار سامنے آتے ہیں انہوں نے انشائیے کی طرف خصوصی توجہ دی۔ اور اسے ایک علیحدہ صنفِ ادب کے طور پر اپنایا۔ انشائیے کے دورِ زریں میں سب سے پہلے ڈاکٹر وزیر آغا کا نام آتا ہے۔ بحیثیتِ انشائیہ نگار وزیر آغا موضوع کی تازہ کاری کو ہی اہمیت نہیں دیتے بلکہ اسلوب کی ندرت کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ ان کا تخلیقی اسلوب محض انشائیہ کی تکنیکی ضرورت کو پورا نہیں کرتا بلکہ یہ ان کی عمر بھر کی ریاضت کا ثمر اور تہذیبی شخصیت کا پرکھ بھی ہے۔ وزیر آغا اپنے اسلوب میں کہیں تمثیلی انداز اختیار کرتے ہیں۔ کہیں علامت، تشبیہ یا استعارے کا سہارا لیے ہیں، تو کہیں طنز و مزاح سے اپنے اسلوب میں شگفتگی پیدا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان تینوں مجموعوں میں وزیر آغا نے جذبہ و خیالی کی مختلف نوعیتوں کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔

قیوم نظر نے ان کے انشائیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> وزیر آغا کے انشائیوں میں زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ یا اس کا فلسفہ، نئی اور پرانی اقدار کا تقابل، اقتصادی مسائل سے آگاہی، تہذیبی سلسلوں کا شعور معتدل اندازِ بیاں، تشبیہات اور استعارات کا استعمال، ہلکے پھلکے مزاح کی چاشنی یہ سب مل کر پڑھنے والے کو خوش مزگی کے عالم میں اپنے گردوپیش کا جائزہ لینے پر اکساتی ہیں۔(۱۰)

وزیر آغا کے انشائیوں کے تین مجموعے "خیال پارے"، "چوری سے یاری تک" اور "دوسرا کنارہ" منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ان کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ "خیال پارے" اس وقت شائع ہوا جب انشائیے کی انفرادیت پورے طور پر نمایاں نہیں تھی اور انشائیہ کے لیے مزاح کو تقریباً ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ چناچہ "خیال پارے" میں مزاح کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں اور موضوع کے مخفی مفاہیم تک رسائی اور نکتہ آفرینی ان کے اولین انشائیوں میں موجود ہے۔ "چوری سے یاری تک" کے انشائیوں میں مزاح کے بجائے ایک ہلکا سا

تبسم اور شوخی کے بجائے سنجیدگی نمایاں ہے۔"چوری سے یاری تک"کے انشائیے فنی طور پر "خیال پارے"کے انشائیوں سے ایک قدم آگے ہیں۔وزیر آغا کے انشائیوں کا تیسرا مجموعہ ۱۹۸۲ء میں"دوسرا کنارہ"کے نام سے شائع ہوا ہے۔"خیال پارے"اور"دوسرا کنارہ"کے درمیان تقریباً بیس سال کا وقفہ ہے۔"دوسرا کنارہ"کا انشائیہ نگار چیزوں کو دیکھتے ہی ان کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔ان کے انشائیوں کے متنوع اور رنگارنگ موضوعات ان کے وسیع تجربے اور گہرے مشاہدے کے غماز ہیں۔

غلام جیلانی اصغرؔ کا شمار ایسے انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو انشائیے کو پرانے درڑے سے نکال کر نئے مدار میں سرگرمِ سفر ہونے کی راہ دکھائی۔انہوں نے حقیقت کو قبول شدہ نظریات کی روشنی میں دیکھنے کے بجائے حقیقہ کی نشاط ثانیہ عمل میں لانے کی کوشش کی ہے اور یوں ہمارے سامنے ایک ایسا جہالتِ دیگر روشن کر دیا ہے جس کے زاویے بو قلموں اور قرینے انوکھے ہیں۔جیسا کہ ان کا انشائیہ "مکان بنانا" ہے جس میں جیلانی اصغرؔ نے زمین کے داخل کی کھدائی اور اس کی گہرائی کو ایک انشائیہ نگار کی تیسری آنکھ سے دیکھا ہے اور نئے زاویے تراشنے کے علاوہ مروجہ نقوش کی تراتیب بھی بدل دی ہے۔غلام جیلانی اصغرؔ کے انشائیوں میں جو فطری شگفتگی موجود ہے اس کے کچھ نمونے مزاح کے دائرے میں بھی داخل ہو جاتے ہیں چناچہ وہ لوگ جو انشائیہ کو مزاحیہ مضمون ہی کی صورت قرار دینے پر مصر ہیں۔وہ اپنی شہادت کے لیے غلام جیلانی کے انشائیوں کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔گویا مزاح کی تخلیق غلام جیلانی کا بنیادی مقصد نہیں بلکہ جس طرح ان کی گفتگو میں شوخی ہوتی ہے اسی طرح مزاح ان کی تحریر کا ہی اسلوب ہے۔

اردو انشائیہ کے دورِ زریں میں ایک نام جس نے طنز و مزاح کی معینہ حدود سے ہٹ کر انشائیہ کے اصلی مزاج کو سمجھنے کا ہوش مندانہ ثبوت دیا "مشتاق قمر" کا ہے۔انشائیہ کی وہ سب خوبیاں مثلاً انکشافِ ذات، غیر رسمی، اختصار، شگفتگی، عدم تکمیل، اور تازگی وغیرہ جن سے انشائیہ کا فطری مزاج تشکیل پاتا ہے ہمیں مشتاق قمر کے انشائیوں میں ملتی ہیں۔ان کے انشائیوں کا مجموعہ "ہم ہیں مشتاق"۱۹۷۰ء میں شائع ہوا تھا۔مشتاق قمر کا شمار ان انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے انشائیے کو ترویج و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اردو انشائیے کی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔فطرت پرستی "مشتاق قمر" کے انشائیوں کا غالب رجحان ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ انہوں نے اپنے انشائیوں میں صرف ایک ہی رجحان پیش کیا ہے۔ان کے انشائیے"بھول جاتا"،"شہرت کی مخالفت"، "چھڑی"،"اقبال کی ایک تصویر"اور"میرا کتب خانہ"وغیرہ میں موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔یوں وقت

گزرنے کے ساتھ ساتھ انشائیے کی صنف میں لکھنے والوں میں اضافہ ہوتا رہا اور اب انشائیہ ادب میں الگ صنف کے طور پر جانا اور مانا جاتا ہے۔

جونؔ ایلیاہ کی انشائیہ نگاری:

جونؔ ایلیا برصغیر میں نمایاں حیثیت رکھنے والے شاعر، فلسفی، عالم اور انشائیہ نگار تھے۔ وہ اپنے انوکھے اندازِ تحریر کی وجہ سے سراہے جاتے تھے۔ جونؔ کو عربی، انگریزی، فارسی، سنسکرت اور عبرانی زبانوں میں مہارت حاصل تھی۔

جونؔ ایلیا ۱۴ دسمبر ۱۹۳۷ء کو اتر (یو۔پی) کے ایک شہر امروہہ میں پیدا ہوئے۔ جونؔ اپنے بہن بھائیوں رئیس امروہوی، کمال امروہوی، سید محمد تقی اور سید شاہِ زناں نجفی سے چھوٹے تھے۔ ان کے والد کا نام علامہ شفیق حسن ایلیا تھا جو کہ فن اور ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ اِسی طرح ان کے والد بخوبی اور شاعر بھی تھے۔ جونؔ کو ابتدا ہی سے علمی و ادبی ماحول میسر آیا جس کی وجہ سے ان کی طبعیت کی تشکیل بھی انہی خطوط پر ہوئی۔ اِسی لیے انہوں نے اپنا پہلا شعر صرف 8 برس کی عمر میں لکھا۔

جونؔ نے اُردو میں ایم اے کیا۔ فارسی میں الہٰ آباد بورڈ سے کامل (یونی فارسی کا سب سے آخری امتحان) کیا۔ امروسے کے دیو بندی مسلک دارالعلوم "دارالعلوم ملدنہ" سے عربی ادب، منقولات اور معقولات میں فارغ التحصیل ہوئے۔ اس کے علاوہ شیعہ دارالعلوم سید المدرس سے "سید الافاضل" کی سند حاصل کی۔ ۱۹۵۸ء میں ایک علمی ادارے "اِدارہ ذہنِ جدید" کی بنیاد رکھی اور ایک علمی ماہنامہ "انشا" جاری کیا جس نے چند سال بعد ترقی کر کے "عالمی ڈائجسٹ" کا نام پایا۔ ۱۹۲۳ء میں آغاخانیوں کے عالمی تحقیقی اور عملی اِدارے سے منسلک ہوئے اور تاریخِ عرب قبلِ اسلام، مذاہبِ عالم، تاریخِ اسلام اور مسلم فلسفے خاص طور پر باطنی فلسفے پر متعدد کتابیں ترجمہ اور تالیف کیں۔

جونؔ برصغیر کی تقسیم کے وقت کمیونسٹ خیالات کے حامل تھے جس کی وجہ سے وہ اِس تقسیم کے سخت خلاف تھے لیکن پھر اِن کے تینوں بھائی پاکستان آ چکے تھے۔ اس لیے جونؔ کو بھی پاکستان آنا پڑا اور ۱۹۵۷ء میں جونؔ نے پاکستان ہجرت کی اور کراچی کو اپنا مسکن بنایا۔ اور بہت ہی تھوڑے عرصے میں وہ شہر کے ادبی حلقوں میں مقبول ہو گئے۔ جونؔ کی شاعری اور نثر ان کے متنوع مطالعے کا واضح ثبوت ہے۔ جونؔ ایلیا کافی

عرصہ بیمار رہے اور پھر ۸ نومبر ۲۰۰۲ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ جونؔ کے پانچ شعری مجموعے اور دو نثری مجموعے ہیں جن میں سے ایک "فرنود" بھی ہے جو کہ مضامین و انشائیوں پر مشتمل ہیں۔

جونؔ ایلیا کی شاعری سے ایک زمانہ واقف ہے لیکن وہ ایک انشائیہ نگار بھی تھے۔ قدرت کی جانب سے یہ ہنر بہت کم لوگوں کو ودیعت ہوتا ہے۔ کراچی سے تعلق رکھنے والے بینکار خالد احمد انصاری نے جونؔ ایلیا کے انشائیوں و دیگر مضامین کو یکجا کر دیا ہے۔ یہ انتخاب ۱۹۵۸ء سے ۲۰۰۲ء کے درمیانی عرصے میں انشاء عالمی ڈائجسٹ اور سسپنس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے تحاریر پر مشتمل ہے۔ کتاب کا نام "فرنود" تجویز کیا گیا۔ فرنود کے معنی دلیل، سند یا مثال ہیں۔ یہ نام جونؔ نے خود تجویز کیا تھا اور اس بات کا اظہار خالد انصاری کتاب کے دیباچے میں کرتے ہیں۔

فرنود میں جونؔ ایلیا کے کل ۸ مضامین شامل کیے گئے ہیں جبکہ انشائیوں کی تعداد ۱۷ ہیں۔ تمام انشائیوں اور مضامین کا طرزِ تحریر بے ساختہ ہے۔ کچھ سفاک اور کہیں کہیں لب و لہجہ ایسا ہے کہ فساد خلق بپا ہو جائے، لیکن جونؔ ایلیا اس متوقع خوف و فسار خلق سے بے پرواہ لکھتے چلے گئے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ اس نوع کے مضامین آج کے زمانے میں لکھے جائیں تو لکھنے والا معتوب قرار پائے، خصوصاً سیاسی حلقوں کی جانب سے چند مقامات پر بیان کا حکومتی گرفت میں آنا بھی یقینی نظر آتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود جونؔ کے طرزِ تحریر پر میں اپنے قارئین کو جکڑ لینے کی خاصیت پائی جاتی ہے۔

"فرنود" میں شامل تحریروں کے ذریعے جونؔ ایلیاہ نے اپنے دل کے غبار نکالا ہے یہاں ہمیں وہ جونؔ ایلیا نظر آتے ہیں جو اپنے بھائیوں کے مقابلے پر خود کو خیال پسند، مثالیت پسند اور اپنے رجحانات میں بے حد ضدی سمجھتے تھے۔ سو قلم چلاتے وقت بھی یہی کیفیات ان پر غالب نظر آتی ہیں۔ چھوٹی بات، چونکا دینے والے نظریات اور اظہار کا بے باک انداز ہے۔

جونؔ نے غربت و افلاس کے دن دیکھے، پھر اپنی اور مستقل مزاجی سے عملی زندگی کے مرحلے طے کیے۔ لہٰذا جونؔ کی تخلیقات صرف مشاہدے کا نہیں بل کہ ان کے تجربات کا نتیجہ ہیں۔ فلسفہ، منطق، اسلامی تاریخ، اسلامی صوفی روایات، اسلامی سائنس اور مغربی ادب پر جونؔ کا علم کسی انسائیکلو پیڈیا کی طرح وسیع تھا۔ انہوں نے متنوع موضوعات پ ر قلم اُٹھایا جن میں سماجیات، سیاسیات، فلسفہ، تاریخ، نفسیات، مذہبی اور علمی و ادبی موضوعات شامل ہیں۔ جونؔ کے سیاسی اور سماجی موضوعات پر مبنی انشائیوں سے ہر دور کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس بات کا پتہ بھی چلتا ہے کہ حکومتوں نے اپنے ہی ملک کی عوام کو

کس کس بات کے بارے میں کتنا لاعلم رکھا ہے۔ اسی طرح تاریخی حوالے سے بھی اِن کے انشائیے اس دور کی عکاسی اور ترجمانی کرتے ہیں۔ جونؔ نے ممنوع سمجھے جانے والے موضوعات بھی زیر بحث لائے اور نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی کہیں کوئی ناانصافی یا بڑا واقعہ رونما ہوتا تو اس پر بھی قلم اُٹھاتے اور عمدہ انشا پردازی کرتے۔ اِسی طرح خواتین کے ایسے مسائل جن پر کسی کو لب کشائی کا حوصلہ نہ تھا۔ جونؔ نے اس پر بھی لکھا اور عصمت فروشی پر قلم اُٹھایا۔ ۱۹۷۱ء اک بھارت جنگ سقوطِ ڈھاکہ، اُردو سندھی مسئلہ غرض اس اکھاڑ پچھاڑ کے دنوں میں انہوں نے قلم کا حق ادا کر دیا۔ ان انشائیوں کا شعلے اُگلنا جلالی لہجہ جونؔ کے جذبات اور کرب کا عکاس ہے۔

جس طرح جونؔ کا مطالعہ وسیع تھا اور انہیں ہر علوم پر عبور حاصل تھا بالکل اِسی طرح انہوں نے اپنے انشائیوں کو کسی خاص موضوعات تک محدود نہیں رکھا بل کہ انہوں نے متنوع قسم کے موضوعات پر لکھا۔ اگر ہم سماجی حوالے سے دیکھیں تو انہوں نے سماجی بے انصافیاں، اظہارِ رائے پر پابندی، خود غرضی، قتل و غارت، انسانی اقدار کی پامالی، نسلی و لسانی امتیازات اور ان کی بنیاد پر پائی جانے والی نفرت، جدت، کی مخالفت، جہالت، حکمرانوں پر تنقید اور یہاں تک کے کراچی کے حالات و واقعات کو بھی نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے ۔ صرف یہی نہیں بل کہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سارے معاشرتی مسائل کو بھی انہوں نے موثر انداز میں پیش کر کے قلم کا حق ادا کر دیا ہے۔ کسی بھی قوم کی سیاست کا اثر اس دور کے معاشرے اور افراد پر پڑتے ہیں۔ اِس لیے ایک ادیب ہونے کی حیثیت سے جونؔ اس دور کی سیاست کو نظر انداز نہیں کر سکے اور سیاسی حوالے سے بھی بہت اچھے انشائیے پیش کیے جن میں جہاں ملکی سیاست پر بات کی گئی ہے وہاں عالمی سیاست کے حوالے سے بھی کچھ انشائیے ملتے ہیں۔ جن میں سیاستدانوں پر تنقید کرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان میں آنے والے اہم اداروں کا بھی تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔ اِسی طرح دوسرے ملکوں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کو بھی بیان کیا ہے۔ جن میں پاک ایران دوستی اور پاک بھارت دشمنی کا واضح انداز میں تذکرہ ملتا ہے اور اِس دشمنی کی بنیاد پر مسئلہ کشمیر کے متنازعہ ہونے اور اس کو حل کرنے کی بھی تلقین کی گئی ہے۔

جونؔ نے سماجیات اور سیاست کے علاوہ فلسفے کو بھی نہایت مہارت سے اپنے انشائیوں میں جگہ دیں۔ جس میں فلسفے کی اہمیت واضح کرنے اور ماضی میں فلسفیوں کی مخالفت کرنے اور انہیں سزائیں دینے کے علاوہ مختلف فلسفوں کو انتہائی موثر انداز اور حیت ورواں عبادت میں تحریر کیا ہے۔ اِسی طرح نفسیاتی موضوعات میں نہ صرف اپنی نفسیاتی کیفیت کو بل کہ معاشرے کے افراد کی نفسیاتی کیفیات کو دل نشین پیرائے میں بیان کیا

ہے اور اِن انشائیوں میں جونؔ نے اپنی رائیگانی کا متعدد بار ذکر کیا ہے جس میں یاسیت پسندی واضح ہو کر چمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔

تاریخ کو مدِ نظر رکھ کر اور اس سے سبق حاصل کر کے ہی قومیں ترقی کرتی ہیں۔ لیکن بعض قومیں اپنی تاریخ کو فراموش کر دیتی ہیں۔ لیکن ایک ادیب ہونے کے ناطے جونؔ نے تاریخ کو بھی اپنے انشائیوں میں بیان کیا۔ اور نہ صرف تاریخ کی اہمیت کو واضح کیا اور تاریخ کے شعور سے آگاہی کی تلقین کی مل کر برصغیر اور مسلمانوں کی تاریخ کو بیان کرنے کے ساتھ اسلامی تاریخ کو بھی عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔ اِس کے علاوہ انہوں نے ان مورخین کو تنقید کا نشانہ بنایا جو کہ دولت کے حصول یا مقام و مرتبے کے لیے تاریک کو بدل دیتے ہیں اور تاریخ کا حق صحیح طریقے سے ادا نہیں کرتے۔ اِسی طرح مذہبی حوالے سے بھی انہوں نے نہایت اچھے انشائیے لکھیں اور مذہبی فرقہ واریت کو نہ صرف بیان کیا بل کہ اس فرقہ واریت کی بناء پر ہونے والے فسادات کو بھی الفاظ کا روپ دے کر قارئین کے سامنے لائیں۔ علمی و ادبی موضوعات پر مبنی انشائیوں میں جونؔ نے اُردو کے آغاز، مولوی عبدالحق کی اُردو کے حوالے سے خدمات اور خاص کر شمالی ہند اور جنوبی ہند میں اُردو کے مستقبل کے بارے میں انتہائی تفصیل کے ساتھ معلومات پہنچائی ہیں اور اقبال کے کلام کو شخصیت پرستی کی وجہ سے مسخ کر کے پیش کرنے پر دکھ کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

یوں جونؔ کے انشائیے پڑھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جونؔ کا نہ صرف مطالعہ وسیع تھا اور ان کے پاس معلومات کا ذخیرہ تھا بل کہ انہیں اس معلومات کو الفاظ میں ڈھالنے کا فن بھی آتا تھا۔ اور انہوں نے صرف محدود موضوعات کو بیان نہیں کیا بل کہ متنوع موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے اور جو سب سے زیادہ اہم موضوعات یا مسائل تھے انہیں جونؔ نے صرف ایک انشائیے میں بیان نہیں کیا بل کہ انہیں متعدد انشائیوں میں بیان کیا ہے تاکہ عوام ان مسائل کا ادراک کر کے ان پر غور کریں اور اس کے حل کے لیے تدبیر نکالیں۔

جونؔ کے انشائیوں میں دنیا کے نام ور فلسفی کے ہم مشرب دکھائی دیتے ہیں۔ جونؔ کی شاعری میں دوئی اور ہم کلامی کا اسرار آمیز عنصر بخوبی ملتا ہے یہی عنصر ان کی نثر میں بھی بہ کمال موجود ہے۔ جو 90 کی دہائی میں "نتیان" کے نام سے سامنے آتا ہے۔ یونانی خدوخال، الجھے ہوئے بالوں والا یہ نوجوان جونؔ ایلیا کا ہم زاد ہے، جو ہر وقت انسانی اقرار کی پامالی پر فسردہ و رنجیدہ یا طیش و غیظ کی حالت میں رہتا ہے۔ اس کی آمد ایک ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہے اور جب کبھی وہ جونؔ ایلیا سے ہم کلام ہوتا ہے تو ان دونوں کی فلسفہ و منطق سے مرصع گفت گو قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے۔ جونؔ نے ہمیشہ خود کو وجدان کا آدمی قرار دیا۔ اس کا ثبوت

ان کا نومبر ۲۰۰۲ء میں لکھا گیا اور دسمبر ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا انشائیہ "تمہارا شکریہ" ہے۔ اس انشائیے میں وہ رقمطراز ہیں کہ "جونؔ ایلیا مر گئے"۔ یہ ان کی آخری تحریر ہے جو انہوں نے اپنی وفات سے کچھ دن قبل سپردِ قلم کی۔ یہ تحریر پڑھنے والوں کو چونکا ہی نہیں، بہت کچھ سوچنے پر بھی مجبور کر دیتی ہے۔

جونؔ نے اپنی نثر کا آغاز چونکہ ماہ نامہ "انشا" میں اداریہ نگاری سے کیا تھا اور یہ نثری تحریریں ضرورتاً لکھی گئی تھیں لیکن جونؔ نے ان کو اتنی مہارت اور عمدگی سے لکھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ اداریے انشائیوں کی شکل اختیار کر گئے کیونکہ جونؔ انہیں تحریر کرنے کے بعد اِن تحریروں کو بار بار دیکھتے، نفیس مضمون کی موثر رسانی کے لیے لفظ چُنتے، لفظ بدلتے، سطروں کی شکنیں ہموار کرتے۔ عبارتیں تراشتے رہتے یوں ان تحریروں کو جونؔ پورے انہماک کے ساتھ قلم بند کرتے ہیں۔

اِس سلسلے میں جونؔ خود کچھ یوں رقمطراز ہیں:

> نثر کاری میں بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ یہ شاعری نہیں جو چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، ہر حال میں سرزد ہو جائے۔ نثر کے لیے خود کو باندھ کے، جکڑ کے بیٹھنا پڑتا ہے۔ (۱۱)

جونؔ امروہہ سے ہجرت کر کے جب کراچی آتے تو انہوں نے ماہ نامہ "انشاء" میں اداریے لکھے اور اس وقت جونؔ کے بھائیوں رئیس امروہوی اور سید محمد تقی کا شمار نام ور ادیبوں میں ہوتا تھا لیکن جونؔ نے اپنی ذہانت، اندازِ بیان اور اعلیٰ پایے کی نثر لکھ کر اپنی الگ شناخت بنائی۔

جنگ اخبار کے میگزین میں جونؔ کے حوالے سے شائع ہونے والے مضمون میں عرفان جاوید کچھ یوں لکھتے ہیں۔

> جونؔ بہت عمدہ اداریہ لکھتے تھے۔ ان کی نثر اعلیٰ پایے کی تھی۔ جونؔ نے اپنی جداگانہ حیثیت منوائی۔ وہ رئیس اور تقی کے بھائی کے بجائے اپنے حوالے سے پہچانے جاتے تھے۔ (۱۲)

جونؔ نے نثر لکھنے سے پہلے شاعری کی تھی اور وہ بحیثیت شاعر ایک الگ مقام رکھتے تھے اور بطور شاعر شہرت حاصل کر چکے تھے لیکن جب ان کی نثر قارئین تک پہنچی تو نہ صرف قارئین بل کہ ان کے حلقہ احباب اور متعلقین سبھی کو رشک آمیز تعجب ہوا کہ کوئی شاعر اتنی اچھی نثر بھی لکھ سکتا ہے۔

اس سلسلے میں شکیل عادل زادہ عفی عنہ لکھتے ہیں:

ایک شاعر کسی شان دار، پر وقار نثر یہ قادر ہے، ایسی نثر جو علم، فکر، زبان اور دانش کے بغیر ممکن نہیں۔ (۱۳)

جونؔ کے انشائیوں کی عبارت چست رواں، شستہ و شگفتہ، خوش گوار اور دل نشین ہے لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے تو اِن کے انشائیوں کی زبان سادہ نہیں بل کہ مشکل ہے اور اس کا اندازِ بیاں بھی بہت الجھا ہوا ہے جو کہ آسانی سے سمجھ نہیں آتا۔ اس کے علاوہ اگر الفاظ کے انتخابات کی بات کی جائے تو جونؔ نے الفاظ کا انتخاب نہایت عمدہ کیا ہے اور ان کی اس نثر کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ الفاظ شعوری نہیں بل کہ غیر شعوری طور پر اُمڈ رہے ہیں۔ اِسی طرح ان کے انشائیوں میں جلال آمیز لہجہ بھی نظر آتا ہے۔ جونؔ کی نثر کے حوالے سے تشکیل عادل زادہ عفی عنہ اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

جونؔ کی نثر میں ایک آہنگ، شکوہ یقین، حکم، تمکنت اور خطاب نمایاں نظر آتا ہے۔ اُن پیرایہ اظہار میں ایک جرات مند، بے باک، ناراض اور تونگر شخص کی تصویر پر اُبھرتی ہے، اور یقیناً ایک ہم نفس، غم گسار، دل دار شخص کی بھی۔ (۱۴)

جونؔ نے اپنی نثر کے ذریعے دانش و حکمت کے ایسے جوہر بکھیرے جو غور و فکر کرنے والے ذہنوں کے لیے سامانِ فکر و خیال ہیں۔ کیونکہ انہوں نے فلسفے کے موضوعات کو بھی اپنے انشائیوں میں بیان کیا ہے۔ اور اس موضوع پر اس انداز میں انشائیے لکھیں کہ جونؔ کی اِس موضوع پر گرفت واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ اور ان کے مطالعے کی وسعت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اِسی لیے ان کا یہ انشائیے اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔

خالد انصاری لکھتے ہیں:

جونؔ نے ۱۹۵۸ء سے نومبر ۲۰۰۲ء تک اُردو ادب کو اپنے نثری فن پارے عطا کیے۔ جن کا شمار بلاشبہ اُردو کی اچھوتی اور شاہ کار تحریروں میں کیا جانا چاہیے۔ (۱۵)

اگر موضوعات سے ہٹ کو جونؔ کی انشائیہ نگاری کی بات کی جائے تو جونؔ اپنے انشائیوں میں ماضی الضمیر کو سیدھے سادھے انداز میں بیان نہیں کرتے بل کہ ان کے انشائیوں میں افسانوی رنگ واضح نظر پیش ہے۔ وہ اپنے انشائیے اس طرح سے لکھتے ہیں کہ ہر بات کو کہانی بتا دیتے ہیں۔ یعنی کہ جون اپنے انشائیے کہانی کی طرز میں لکھتے ہیں اور یوں ان کے انشائیوں میں کہانی پن پایا جاتا ہے۔

جونؔ کا نہ صرف اندازِ بیان منفرد، نرالا اور اچھوتا تھا بل کہ انہوں نے تحریر میں انشاپردازی کے حسن کے ساتھ ساتھ متن کی توانائی کا بھی التزام رکھا ہے۔ یوں جونؔ ایک منفرد شاعر کے ساتھ ساتھ ایک منفرد نثر نگار کے طور پر بھی سامنے آتے ہیں اور ان کی یہ نثری تحریریں بھی ان کی شاعری کی طرح ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ شکیل عادل عفی عنہ لکھتے ہیں:

> ارد گرد کوئی نظر نہیں آتا جس نے جونؔ ایلیا کے زمانے میں اور اُن کے جانے کے بعد اُن جیسے انشائیے تخلیق کیے ہوں، کوئی ہو تو جونؔ ایلیا کے نیاز مند اُس قیصرِ قلم، خسروِ سخن کی بارگاہ میں بازیابی اور بندگی کے لیے مضطرب ہیں۔[۱۶]

حوالہ جات

۱۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، "کشاف تنقیدی اصلاحات"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع دوم، ستمبر ۱۹۸۵ء، ص۱۸

۲۔ مشکور حسین یاد، "ممکناتِ انشائیہ"، یولیمر پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۲۴

۳۔ جمیل آذر، اُردو کے بہترین انشائیے، "پیش لفظ"، ص ۱۰، مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا، ۱۹۷۶ء

۴۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، "اُردو میں انشائیہ نگاری"، نذیر سنز پبلشرز، ۱۹۸۶ء، ص ۴۸

۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، "دوسرا کنارہ"، مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا، ۱۹۸۲ء، ص ۸

۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، "انشائیہ اُردو ادب میں"، مکتبہ فکر فیصال، لاہور، جنوری ۱۹۸۵، ص ۳۷

۷۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، "مضامینِ سرسید" (مقدمہ)، مکتبہ "خیابانِ ادب، لاہور، جنوری ۱۹۶۷ء، ص ۵

۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، "انشائیہ اُردو ادب میں"، مکتبہ فکر، خیال، لاہور، جنوری ۱۹۸۵ء، ص ۱۶۰

۹۔ ایضاً، س ن، ص ۱۲۰

۱۰۔ قیوم نظر، "انشائیوں کا ایک مجموعہ"، سالنامہ اُردو زبان، سرگوھا، مئی جون ۱۹۶۸ء ص ۱۸۵

۱۱۔ شکیل عادل عفی عنہ، مضمون (ماجرا) مشمولہ فرنود، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۲۶

۱۲۔ روزنامہ جنگ، اسلام آباد، ۱۸ اپریل ۲۰۱۸ء۔

۱۳۔ شکیل عادل عفی عنہ مضمون "ماجرا"، مشمولہ فرنود، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۲۰

۱۴۔ ایضاً، س ن، ص ۲۷۔

۱۵۔ خالد احمد انساری، مضمون "خون تھوکنے کے کارخانے میں"، مشمولہ فرلود، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۳۷

۱۶۔ شکیل عادل حفی عنہ، مضمون "ماجرا"، مشمولہ، فرنود، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۳۲

باب دوم:

"سماجی موضوعات"

سماج اور معاشرہ ہم معنی ہے اس لیے جہاں معاشرے کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد سماج ہی ہوتا ہے۔ فرد اور معاشرے کا چولی دامن کا ساتھ ہے کیونکہ افراد سے ہی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ اور فرد جس معاشرے میں پیدا ہوتا ہے اس معاشرے کی قدریں، مہارتیں اور زبان سیکھتا ہے۔ جس کی بدولت وہ اِس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے معاشرے کے ساتھ ہم آہنگی اور بہتر طور پر مطابقت اختیار کر سکے، لیکن مطابقت اختیار کرنے کے باوجود بھی اس معاشرے میں کہیں نہ کہیں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے بے شمار معاشرتی مسائل جنم لیتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج کی دنیا میں انسان کو جن مسائل کا سامنا ہے وہ اس کے اپنے پیدا کردہ ہیں۔ انسان کے یہ معاشرتی مسائل انسانی غفلت اور انسانی بے حسی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔

انسان کے معاشرتی مسائل کا اگر جائزہ لیا جائے تو قدیم دور سے لے کر آج تک انسان کا سب سے بڑا مسئلہ حیاتیاتی بقاء کا مسئلہ رہا ہے جو کہ جدید دور میں بھی جوں کا توں موجود ہے۔ اِس مسئلے کے حل نہ ہونے کی بڑی وجہ دولت کے چند ہاتھوں میں محدود ہونا اور اس کی غیر منصفانہ تعلیم ہے کیونکہ ہمارے ہاں طبقاتی نظام اور سرمایہ دارانہ نظام رائج ہے۔ جس کی بدولت دولت صرف چند ہاتھوں میں گردش کرتی ہے حالانکہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے۔ جہاں اسلام کے اُصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کا درس ملتا ہے جو کہ سرمایہ دارانہ نظام کی سخت مخالفت کرتا ہے اور اسلام کی تعلیمات کے مطابق مساوات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سب کو اس کا حق ملنا چاہیے، لیکن ہم نے اسلام کی تمام تعلیمات کو پسِ پُشت ڈال کر سرمایہ دارانہ نظام کو ترقی دی۔ جس کی وجہ سے اِس نظام کو دن بدن فروغ حاصل ہو رہا ہے اور غریب طبقہ روز افزوں غربت کی دلدل میں دھنستا چلا جا رہا ہے۔

اعجاز فاروقی اپنی کتاب "پاکستان کا فکری بحران" میں اِسی نظام پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> اقتصادی میدان میں سرمایہ دارانہ نظام کی موجودگی میں اسلامی مساوات کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا اور عوام کا اقتصادی استحصال دن بدن بڑھتا گیا۔ (۱)

ادیب معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے وہ اِس طبقے سے تعلق رکھتا ہے جو کہ عام لوگوں کے مقابلے میں سماج کے مسائل کو زیادہ شدت سے محسوس کرتے ہیں اور نہ صرف اِن مسائل کا ادراک کرتے ہیں بلکہ اِس کے حل کے لیئے کوشاں بھی ہوتے ہیں۔ یہ ایک مثالی معاشرے کا خواب دیکھتے ہیں ایک ایسے معاشرے کا خواب جہاں تمام انسانوں کو یکساں حقوق حاصل ہوں۔ جہاں کسی کے ساتھ زیادتی نہ کی جارہی ہو۔ ایسا معاشرہ جس میں غریبوں کا معاشی استحصال نہ ہو، لیکن بد قسمتی سے ہمارے مثالی معاشرے کا خواب دیکھنے کے باوجود اس کی بقیر ممکن نہ ہو سکی، کیونکہ ہمارے معاشرے میں ایک ایسا نظام رائج ہو چکا ہے جس کو دن بدن فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ اور یہ سرمایہ دارانہ اور طبقاتی نظام ہے جس کی وجہ سے معاشرے میں دو طبقے قائم ہو چکے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جس کے افراد کے پاس نہ صرف ضروریاتِ زندگی کا تمام سامان موجود ہے بلکہ وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ اپنی دولت کے نشے میں ڈوبے ہوئے ہیں کیونکہ اِن کے پاس بے پناہ دولت ہے جبکہ دوسرے طرف وہ طبقہ بھی ہے جو کہ دو وقت کی روٹی کے لیے تگ و دو کرتا ہے۔ اِس طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد اپنی بنیادی ضروریات تک کو پورا نہیں کر پاتے۔

جوؔن ایلیا نے اِسی طبقاتی تقسیم کے حوالے سے بات کی ہے اور سماج کے اِس سب سے بڑے مسئلے کو اپنے متعدد انشائیوں میں بیان کیا ہے۔ جوؔن کہتے ہیں کہ جب پاکستان کا قیام عمل میں لایا گیا اس وقت سب متحد تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ قوم بکھرتی گئی اور بکھرتے بکھرتے یہ ایک ایسی قوم بن گئی جسے دوسروں کے نفع و نقصان سے کوئی غرض نہیں رہی۔ اِن کے درمیان بے حسی اور خود غرضی نے جنم لے لیا اور پھر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی دُھن میں سب ایک دوسرے کا معاشی استحصال کرنے لگے، لیکن اِس دوڑ میں صرف غریب طبقے نے ہی نقصان اُٹھایا۔ اور اِس کا معاشی استحصال اس طرح ہوا کہ اِسے بنیادی ضروریات پورا کرنے کے لیے بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور دوسری طرف اِس استحصال کے نتیجے میں سرمایہ دار طبقہ مضبوط ہوتا ہے۔ اِس طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد بے پناہ دولت ہونے کے باوجود مزید دولت حاصل کرنے کی ہوس میں مبتلا ہیں۔ اِن کی اس ہوس کی وجہ دوسروں سے آگے نکلنے کی خواہش ہے اور وہ اِس دوڑ میں کامیابی حاصل کرنے کی خواہش میں غریبوں کا حق چھینتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ دولت کی اِس نمود و نمائش اور اِس دوڑ میں سب سے آگے نکل جائیں۔ اِس لیے وہ غریب لوگوں کے دکھوں، غموں اور ان کی تکالیف کا احساس نہیں کرتے بلکہ ان کی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

اس حوالے سے علی عباس جلال پُوری اپنی کتاب "عام فکری مغالطے" میں لکھتے ہیں:

> ایک سرمایہ دار کارخانہ قائم کرتا ہے اور اسے کامیابی سے چلاتا ہے۔ اس کارخانے سے معقول آمدنی ہوتی ہے وہ اس پر قناعت نہیں کرے گا، بلکہ ایک اور کارخانہ قائم کرنے کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دے گا۔ جب وہ بھی مستقل آمدنی کا وسیلہ بن جائے گا تو تیسرا کارخانہ لگانے کے لیے تک و دو شروع کر دے گا اور یہ چکر یونہی چلتا رہتا ہے۔[۲]

اِس طرح تمام دولت صرف چند ہاتھوں تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور صرف ایک طبقہ ہی اس سے مستفید ہوتا ہے اور ترقی کرتا ہے۔ جبکہ غریب اِن حالات میں مزید مفلسی کا شکار ہوتا ہے۔ جونؔ کہتے ہیں کہ ایک تو غریبوں کا معاشی استحصال کیا جاتا ہے۔ اِن کو ان کے حقوق نہیں دیئے جاتے اور دوسرا ان پر مصیبتوں کا مزید پہاڑ مہنگائی کی صورت میں نازل کر دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ پہلے ہی تکالیف سے دوچار ہوتے ہیں اور پھر اشیائ مہنگی کر کے ان کے غموں اور تکلیفوں میں مزید اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ جب اشیاء مہنگی کی جاتی ہیں تو اس سے سرمایہ دار طبقے کو ذرا برابر بھی فرق نہیں پڑتا البتہ اس کی وجہ سے غریب افراد مزید کسمپرسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

معاشرہ افراد سے وجود میں آتا ہے۔ معاشرے میں تمام افراد باہم مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہر معاشرہ خوبیوں اور خامیوں کا مرکب ہوتا ہے۔ معاشرے میں جہاں بہت ساری خوبیاں ہوتی ہیں وہیں چند بُرائیاں بھی جنم لیتی ہیں جو آہستہ آہستہ اِس طرح سے پروان چڑھتی ہیں کہ وہ معاشرے کی بنیاد میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ اور جب کوئی برائی معاشرے کی بنیاد میں پیوست ہو جائے اور اسے شروع سے جڑ سے اُکھاڑ کر ختم نہ کر دیا جائے تو پھر وہ سماج کے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ بن جاتی ہے اور اسے ختم کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ برائی کو اِبتداء ہی سے جڑ سے اُکھاڑنا آسان ہوتا ہے بعد میں وہ اپنی جڑیں مضبوط کر لیتی ہے اور سماج میں پھیل جاتی ہے اور پھر اسے ختم کرنا کسی کے بس کی بات نہیں رہتی کیونکہ اگر ایک بُرائی کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ کسی نہ کسی طرح اور روپ میں ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

کسی بھی معاشرے کو مثالی معاشرہ اس وقت کہا جاتا ہے جب اس میں بسنے والے افراد ایک دوسرے کے حقوق احسن طریقے سے ادا کریں۔ ایک دوسرے سے حُسنِ سلوک سے پیش آئیں۔ جس معاشرے میں تمام انسانوں کی جانیں محفوظ ہوں، جہاں اغواء کار نہ ہو، جہاں نہ صرف عزتیں بلکہ مال بھی محفوظ ہو۔ لیکن بد قسمتی سے ایسے مثالی معاشرے کا صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے کیونکہ ہم جس سماج میں سانس لیتے ہیں وہاں

ہر طرف قتل و غارت دیکھنے کو ملتی ہے۔ اغواء برائے تاوان کی وارداتیں عروج پر ہیں۔ یہاں نہ صرف جانیں بلکہ عزتیں تک محفوظ نہیں۔ لوگوں میں انسانیت ختم ہو چکی ہے۔ ان میں بے حسی اور خود غرضی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ انہیں کسی کے دُکھ درد سے کوئی سروکار نہیں۔ اور جس معاشرے میں یہ تمام جرائم اس انتہا کو پہنچ جائیں وہاں کا امن و سکون تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

جونؔ اپنے انشائیوں "انسان کا شیطان" اور "جرم" میں اِنہی سماجی برائیوں پر بات کرتے ہیں۔ جونؔ کہتے ہیں کہ قدیم دور میں ہر طرف امن و سکون تھا کیونکہ یہ برائیاں اس قدر عام نہیں تھیں جس قدر اب یہ عام ہو چکی ہیں۔ پہلے اگر کوئی چوری کرتا تھا تو یہ بہت بات تصور کی جاتی تھی لیکن اَب یہ جرائم معمولی نوعیت کے جرائم میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اغوا اور قتل جیسی بھیانک برائیاں اب ایک خوش فعلی کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں اور جو لوگ ان جرائم کا ارتکاب نہیں کرتے وہ سن سن کر اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔ معاشرہ اخلاقی زوال کا شکار ہو چکا ہے۔ تمام اخلاقی اقدار کو پسِ پشت ڈال کر جرائم کی جانب قدم بڑھایا جا رہا ہے۔ اِن تمام بُرائیوں کو اس طرح قبول کر لیا گیا ہے کہ جیسے یہ معمول کی بات ہے۔

جونؔ کہتے ہیں کہ اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ تمام برائیاں آج کے زمانے کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ ابتداء ہی سے اس معاشرے میں عدل و انصاف کو فروغ نہیں دیا گیا جبکہ عدل و انصاف کے مقابلے میں ظلم و زیادتی کو فروغ دیا گیا اور اس کے لیے مناسب فضا قائم کی گئی۔ جس کی وجہ سے آج یہ سماج اپنی جڑیں مضبوط کر چکی ہیں کیونکہ کسی بھی معاشرے میں یہ جرائم اس وقت عروج پر پہنچ جاتے ہیں جب اِن کو وقت پر نہ روکا جائے اور گزشتہ تمام صدیوں کی نسبت بیسویں صدی میں اِن جرائم نے بہت ترقی کی۔ یہ جرائم اب اس حد تک پھیل چکے ہیں کہ انہیں معاشرے سے مکمل طور پر ختم کرنا نہایت مشکل ہے۔

اِس حوالے سے جونؔ ایلیا کہتے ہیں۔

> جو زندگی ہم گزار رہے ہیں، دراصل اس کی نہاد اور بنیاد ہی میں خرابی پائی جاتی ہے۔ یہ وہ خرابی ہے جسے اس خرابی کا کاروبار کرنے والے اور اس سے منفعت اندوز ہونے والے عینِ فطرت ثابت کرتے آئے ہیں۔ (۳)

جونؔ ایلیا جہاں معاشرے کی دیگر برائیوں کا ذکر کرتے ہیں اور اسے اپنے انشائیوں میں بیان کرتے ہیں وہیں وہ معاشرے کی ایک اور ایسی برائی کا ذکر کرتے ہیں جو کہ انتہائی قابلِ نفرت ہے۔ جونؔ اپنے انشائیے "عصمت فروشی چند سوال" میں عصمت فروشی کے حوالے سے بات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ

اخلاقی برائی ہمارے معاشرے میں عام ہو چکی ہے۔ جوَن کے مطابق نوجوانوں کی غلط تربیت، خراب ماحول اور بے وجہ قیود اس برائی کا سبب بنتے ہیں۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ سماج کے بنائے ہوئے بے ضابطے اور غیر منصفانہ نظامِ معیشت بھی اِس برائی کو جنم دینے اور پروان چڑھانے کی وجہ بنتا ہے۔ اگر ہم بنظرِ غائر دیکھیں تو قدیم معاشروں میں یہ ہیجان اس قدر عام اور توانا نہیں تھا جس طرح آج کے معاشرے اور دور میں ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ دورِ جدید میں کیا جانے والا عریاں رقص، فلمیں، جسم کی نمائش اور مختلف جگہوں پر آویزاں تصاویر ہیں۔ جو کہ آج کے انسانوں کو اِس برائی کی دلدل میں جانے کی طرف مائل کرتے ہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ ایک بڑی وجہ جو کہ اس برائی کے وجود میں آنے اور اس کو فروغ دینے کی ہے وہ آج کے سماج میں شادی پر کیا جانے والا بے جا خرچ ہے۔ جس کی وجہ سے شادی آج کے دور میں ایک مسئلہ بن گئی ہے کیونکہ اس کے لیے معاشی حوالے سے بہتر ہونا اور بعد میں بہت سے فرائض اور ذمہ داریوں کا سامنے آنا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہی کم ہیں جو شادی کے معاشی تقاضوں کو واقعی پورا کر سکیں۔ اِس لیے بہت سے نوجوان اِن اخراجات سے بچنے اور معاشی طور پر مستحکم نہ ہونے کی وجہ سے اس برائی میں مبتلا ہو جاتے ہیں جو کہ ایک نہایت بد فعل ہے۔

تعلیم کسی بھی قوم کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کوئی بھی قوم اس وقت ترقی کرتی ہے جب اس قوم کے افراد تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوں، کیونکہ تعلیم سے انسان میں شعور آتا ہے اور جب شعور بیدار ہوتا ہے تو وہ قوم اپنی بھلائی کے بارے میں سوچتی ہے۔ اس قوم کے افراد اپنے حقوق سے آشنا ہوتے ہیں لیکن جو قوم جہالت کے اندھیروں میں ڈوبی ہو وہ شعور نہیں رکھتی اور نہ ہی وہ اپنے حقوق کو پہچانتی ہے اسے اس بات کا علم ہی نہیں ہوتا کہ اس کے کون کون سے حقوق ہے اور جب کسی قوم کے افراد اپنے سے واقف ہی نہیں ہوں گے تو وہ اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لیے آواز بلند کیسے کریں گے۔ اِس لیے اپنے مسائل کو حل کرنے اور حقوق کو حاصل کرنے کے لیے تعلیم بہت ضروری ہے۔

اِسی حوالے سے برٹرنڈ رسَل اپنی کتاب "نظامِ معاشرہ اور تعلیم" میں لکھتے ہیں:

> ہمارے مسائل کا علاج یہ ہے کہ لوگوں کو معقول بنایا جائے اور انہیں معقول بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی تعلیم معقول طور پر ہو۔ (۴)

جوَن ایلیا اپنے انشائیے "بنیادی مسئلہ" پر اسی حوالے سے بات کرتے ہیں۔ جوَن کہتے ہیں کہ جہالت ایک ایسا بنیادی مسئلہ ہے جس کی وجہ سے بے پناہ مسائل جنم لیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے حل کے

ساتھ ہی بہت سے اور مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ سماج میں بہت سے افراد ایسے موجود ہیں جو جہالت کے اندھیروں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ جہالت کی وجہ سے شعور سے عاری ہیں۔ یہ ایسے افراد ہیں جو شعور نہ رکھنے کی وجہ سے اپنے حقوق کو نہیں پہچانتے اور چونکہ یہ اپنے حقوق کو نہیں پہچانتے اِس لیے وہ اِن کو حاصل کرنے کے لیے آواز بھی بلند نہیں کرتے۔ اِس لیے اپنی حالت بدلنے اور ترقی کرنے کے لیے جہالت کے ان اندھیروں کو دور کرنے کی ضرورت ہے جو صرف تعلیم اور شعور کی بیداری سے ہی ممکن ہے۔

جوؔن ایلیا تعلیم کی اہمیت بیان کرنے اور جہالت کے اندھیروں کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ آج بھی ہمارے معاشرے میں کئی ایسے افراد موجاد ہیں جو تعلیم کو اہمیت نہیں دیتے اور اسے حاصل کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔ اِس کے ساتھ ہی چند افراد ایسے بھی نظر آتے ہیں جو دوسروں کو یہ احساس وقتاً فوقتاً دلاتے رہتے ہیں کہ تعلیم سے کوئی بڑا آدمی نہیں بنتا۔ عزت و بلندی کا معیار صرف دولت ہے۔ یہی لوگ دوسرے افراد کی نگاہ میں تعلیم کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اپنی اس کوشش کو کامیاب بنانے کے لیے یہ لوگ انہیں ایسے اہلِ علم حضرات کی مثالیں دیتے ہیں جو علم ہونے کے باوجود معاشی طور پر مظبوط نہیں ہوتے اور ساتھ ہی ایسے افراد پر بھی نظر کرتے ہیں جو علم کی کمی اور شعور کے فقدان کے باوجود معاشی اور سماجی طور پر مستحکم ہوتے ہیں۔ اِس طرح ان کا یہ عقیدہ پختہ ہوتا جاتا ہے کہ تعلیم اور شعور کسی مقام اور مرتبے میں اضافہ نہیں کرتے اس طرح علم کی اہمیت روز بہ روز ان لوگوں کی نظر میں کم ہوتی جاتی ہے۔

جوؔن ایلیا مزید اس انشائیے میں کہتے ہیں کہ جہالت کی وجہ سے قوم کو اس بات کا علم ہی نہیں ہے کہ کیا بات ان کے حق میں ہے اور کیا مخالفت میں ہے کیونکہ اگر انہیں اِس بات کا شعور ہوتا تو وہ عائلی قوانین کی مخالفت نہ کرتے حالانکہ یہ قوانین ان کے فائدے کے لیے بنائے گئے تھے۔ اِسی طرح اگر معاشرے میں موجود طبقاتی نظام کی مخالفت کی جائے اور انہیں ان کا حق دلانے کی کوشش کی جائے تب بھی یہ اپنی کم علمی کی بناء پر اس معاشی ناہمواری اور طبقاتی نظام کو اللہ کی مرضی کہہ کر اپنی اسی حالت پر اکتفا کر کے بیٹھ جائیں گے حالانکہ ان کے حق کو ان سے چھین لیا گیا ہے جب ان لوگوں کو اپنے حقوق کا شعور اور علم ہی نہیں ہو گا تو یہ کیسے اپنے مطالبات کے لیے آواز بلند کریں گے۔ اِس کے ساتھ ہی جوؔن ایک اور مثال کے ذریعے اس قوم کے افراد کی جہالت کا ذکر کرتے ہیں کہ اگر کوئی بھی صاحبِ ریش بزرگ یہ کہہ دیں کہ انسان چانکہ ایک ایسی مخلوق ہے جو کہ فنا ہو جائے گی اور فانی مخلوق کائنات کو تسخیر نہیں کر سکتی اور یہ خلا کی بلندیوں تک نہیں پہنچ

سکتی اس لیے امریکہ اور روس نے خلا کو تسخیر کرنے کا واقعہ سنا کر سب کو بے وقوف بنایا ہے تو یہ لوگ اِن باتوں کو سچ تسلیم کر لیں گے کیونکہ وہ جہالت کی وجہ سے کسی بات کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

یہ معاشرہ مسائل میں گھِرا ہوا ہے۔ اس میں بہت سی معاشی اور اخلاقی برائیاں جنم لے چکی ہیں۔ اس قوم کے افراد ہر لحاظ سے پستی کی طرف جا رہے ہیں۔ غریبوں کا معاشی استحصال کیا جا رہا ہے۔ انہیں ہر طرح سے پستی کی طرف دھکیلہ جا رہا ہے۔ ان کے حقوق چھینے جا رہے ہیں۔ نہ صرف امیر طبقہ غریبوں کے حقوق چھین رہا ہے اور انہیں معاشی حوالے سے کمزور کر رہا ہے بلکہ غریب طبقہ بھی اپنے سے کمزور افرد کے حقوق چھیننے میں لگا ہوا ہے یعنی کہ اس معاشرے میں ہر طاقتور اپنے سے کم زور لوگوں کے حق پر ڈاکہ ڈالتا ہے، چاہے وہ امراء ہوں یا غرباء۔ ہر ایک اس برائی میں مبتلا ہے۔ جس کی بناء پر ہر ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اس طرح معاشرے کا امن، سکون تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

اِن تمام مسائل و مشکلات کے حل کے لیے کسی بھی قوم کے افراد کو مل کر کوشش کرنی پڑتی ہے کیونکہ کسی بھی قوم کی حالت اس وقت تاک نہیں بدلتی جب تک اس قوم کے افراد اپنی حالت کو بدلنے کے لیے خود کوشاں نہیں ہوتے کیونکہ جب تک سہ خود تغیر کے لیے اور اپنے حقوق کے لیے آواز بلند نہیں کریں گے اس وقت تک وہ اپنی موجودہ حالت پر ہی قائم رہیں گے۔ قومی شاعر علامہ محمد اقبال نے بھی اس قوم کے حوالے سے یہ بات کہی تھی کہ یہ قوم خوابِ غفلت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اور جو قوم حرکت و عمل پر یقین رکھتی اور اپنی حالت بدلنے کے لیے حرکت و عمل سے کام نہیں لیتی اس قوم کی حالت خدا بھی نہیں بدلتا۔ اس لیے جو قوم آگے بڑھنا چاہتی ہے اور اپنے مسائل کو حل کرنا چاہتی ہے اس قوم کے افراد کو عمل پر یقین رکھنا ہو گا اور اس کے لیے کوشش کرنی ہو گی لیکن بد قسمتی سے اس قوم کے افراد اپنی حالت بدلنے کے لیے کوشش نہیں کر رہے بلکہ اسی حالت پر اکتفا کیے ہوئے ہیں۔

جوؔن ایلیا اپنے انشائیوں "تلخ اور تند" اور "دماغ ماؤف ہیں" میں بھی قوم کے افراد کے اس مسئلے پر بات کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ عوام اپنے مسائل کو سمجھ نہیں پا رہے اور نہ ہی اپنے حقوق کے بارے میں آگاہی رکھتے ہیں۔ وہ اپنی حالت پر اکتفا کر کے بیٹھ گئے ہے۔ یہ لوگ اپنی "حالت بدلنے کے لیے کوشش نہیں کر رہے کیونکہ ان کے نزدیک ان کے حالات اب بدلنے والے نہیں ہیں، اِس لیے وہ ان حالات کو بدلنے کے لیے نہ تو کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے آواز بلند کرتے ہیں۔ لیکن معاشرے کے وہ افراد جو اس معاشرے کو مثالی معاشرہ بنانا چاہتے ہیں اور معاشرے کے تمام افراد کو ان کے جائز حقوق

دلانا چاہتے ہیں وہ جب ان کے حقوق کے لیے آواز بلند کرتے ہیں کہ یہی لوگ ان کا ساتھ دینے کے بجائے ان کے خلاف ہو جاتے ہیں اور اپنی محرومیوں اور درماندگیوں کے علاج کے بجائے ان کے خلاف دلائل ڈھاونڈ کر لاتے ہیں۔ اِس طرح یہ لوگ نہ خود حالات بدلنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو کچھ کرنے دیتے ہیں۔

جوؔن اس حوالے سے مزید کہتے ہیں کہ اس مخالفت کی بڑی وجہ ایک یہ ہے کہ ہم سب جھوٹ میں جی رہے ہیں اور سچ سننا نہیں چاہتے۔ جھوٹ ہمیں وقتی طور پر تو متاثر کرتا ہے لیکن یہ ہمیں فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اِس لیے جوؔن کہتے ہیں کہ ہمیں ان باتوں کی طرف ہر گز دھیان نہیں دینا چاہیے۔ جو ہمیں وقتی طور پر متاثر کرتی ہیں کیونکہ جو باتیں ہمیں وقتی طور پر خوش کرتی ہیں وہ ہمارے حق میں مفید ثابت نہیں ہوتی اور نہ ہی دیرپا ہوتی ہیں۔ سچ چاہے جتنا بھی کڑوا کیوں نہ ہو ہمارے لیے فائدہ مند ہے۔ اگرچہ وقتی طور پر ہمیں اس سچ سے کڑواہٹ محسوس ہو گی۔ ہمیں یہ باتیں بھلی معلوم نہیں ہو گی لیکن بعد میں یہی تمام باتیں ہمارے حق میں بہتر ثابت ہوں گی۔

جوؔن ایلیاء کے مطابق:

> وہ باتیں کب تک سُنے جاؤ گے جو آج تمہیں فقط پسند آ رہی ہیں۔ وہ باتیں کب کہنے دو گے جو کل تمھارے کام بھی آئیں گی۔ یقین جانو کہ تمھارے حق میں سب سے مفید بات وہ ہے جس سے تمھاری سماعت میں زہر گھُل جائے۔[۵]

اس کے ساتھ ہی جوؔن یہ بھی کہتے ہیں کہ آج وہ دور ہے جس میں اگر دوسرے لوگوں کے حق میں کچھ لکھا جائے تو یہ ان پر گراں گزرتا ہے۔ لکھنے اور سچ بات کہنے پر پابندی ہے۔ لکھنے اور کہنے کے لیے بہت کچھ ہے لیکن یہاں لکھنے والے لوگ سننے والوں سے خوف زدہ ہے۔ کیونکہ سچ کی مخالفت کی جاتے ہے اور سچ بات اس قوم کو راس نہیں آتی۔

اس کائنات کے وجود میں آنے کے بعد تمام لوگ مل جل کر رہا کرتے تھے۔ ان میں اتفاق و اتحاد تھا۔ یہ ایک دوسرے کے دکھوں میں شریک ہوتے تھے۔ اور ان کے غموں اور تکالیف میں خود بھی تکلیف محسوس کرتے تھے اسی طرح ایک دوسرے کی خوشی میں پورے دل سے شامل ہوتے تھے لیکن رفتہ رفتہ جب اِن کے درمیان دولت آگئی تو ان کا یہ اتحاد و اتفاق نا اتفاقی میں بدل گیا۔ دلوں میں نفرتوں نے جنم لے لیا۔ ہر ایک خود غرضی اور بے حسی میں اس حد تک آگے نکل گیا کہ اسے دوسروں کے دکھوں اور غموں کا کچھ احساس

ہی نہیں رہا۔ ہر ایک دولت کی ہوس کی خاطر اور اس کو حاصل کرنے کی تگ ودو میں سارے رشتے بھلا بیٹھا۔ اس طرح وہ اپنے فائدے کے حصول کے لیے دوسروں کو نقصان پہنچانے لگے۔ انہیں صرف اپنے فائدے سے مطلب تھا چاہے یہ فائدہ دوسرے افراد کو نقصان پہنچا کر ہی کیوں نہ حاصل کیا جائے۔ یہ برائی بڑھتے بڑھتے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے کیونکہ جب سماج میں کوئی بُرائی جنم لیتی ہے تو یہ صرف کسی فرد یا چند افراد کو ہی متاثر نہیں کرتی بکہ پورے معاشرے کو یہ اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

جوآن ایلیا اپنے انشائیے "خیرِ شامل" میں سماج کی اسی برائی کے حوالے سے بات کرے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان ایک فانی مخلوق ہے جسے اس دنیا سے آخر کار رخصت ہو جانا ہے اس جہاں میں اس کی زندگی عارضی ہے لیکن پھر بھی وہ اس دنیا میں مادی چیزوں کے حصول کے لیے تگ ودو کرتا ہے اور اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے تمام رشتوں کو پسِ پُشت ڈال دیتا ہے۔ وہ دولت کی ہوس میں اس حد تک آگے نکل جاتا ہے کہ رشتوں کا احترام تک بھول جاتا ہے اس کا مقصد محض دولت کا حصول رہ جاتا ہے۔ چاہے یہ دولت کسی بھی ذریعے سے حاصل کی جائے یا پھر کسی کو نقصان پہنچا کر یہ کیوں نہ حاصل کی جائے۔ اس طرح ہر ایک دولت کی ہوس میں اور اس دولت کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہے اور دوسروں کو نقصان پہنچا کر اس معاشعرے کا امن و سکون برباد کرتا ہے۔ اِس طرح یہ دنیا ایک ایسی تجارت گاہ بن چکی ہے جہاں ہر وقت خرید و فروخت ہوتی رہتی ہے اور صرف دولت کی باتیں ہی کی جاتی ہیں۔ جوآن کہتے ہیں ایسی صورتِ حال میں ایک دوسرے کو الزام دینے کی بجائے اس بات کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ اِن مسائل سے کیسے چھٹکارا پایا جائے۔

انہی باتوں کو جوآن یوں بیان کرتے ہیں۔

> یہ ایک ایسی تجارت گاہ ہے جہاں زید کو اپنی منفعت کے لیے بہ ہر قیمت عمرو کو ضرر پہنچانا ہے، خواہ یہ ضرر اپنے نفس میں پورے معاشرے یا پورے جامئہ انسانیہ ہی کا ضرر کیوں نہ ہو۔ یہاں کا ہر اثبات باقی سب کی نفی پر قائم ہے۔[۶]

جوآن یہ تمام باتیں اپنے انشائیوں "لکھت" اور "لکیریں" میں بھی بیان کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ جوآن مزید کہتے ہیں کہ اِن تمام حالات میں لکھنے والے بہت کچھ لکھتے ہیں، وہ مسائل کا ادراک کرتے ہیں اور اسے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے لیے وہ ان برائیوں اور مسائل پر قلم اُٹھاتے ہیں لیکن اِن کے لکھنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ جب تک پوری طرح سچ نہیں بولا جائے گا حالات نہیں بدلیں گے، اور پورا

سچ اِس معاشرے میں ناپید ہے کیونکہ اس سچ کا بھی مول لگ چکا ہے لہٰذا سچ نہ بولنے کے عوض مال و دولت حاصل کی جاتی ہے۔ اِس طرح وہ لوگ سچ نہ بولنے کا دکھ تو سہہ لیتے ہیں لیکن اسے بولتے نہیں ہیں۔ سو یہ تمام حالات بدلنے کے لیے دوسروں کے سچ کا انتظار نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی دوسروں پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ اس لیے جوؔن کے مطابق اس کے لیے ہمیں خود پر بھروسہ کر کے جدوجہد کرنی چاہیے تاکہ ہم حالات بدل سکیں اور دوبارہ سے امن و سکون قائم کر سکیں۔

فرد اور معاشرے کا تعلق بہت گہرا ہے کیونکہ فرد سے ہی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ انسان جو کہ معاشرے کا ایک نہایت اہم فرد ہے جسے قدرت کی طرف سے شعور کی دولت عطا کی گئی ہے۔ یہ ایسی دولت ہے جس کی بناء پر اسے باقی تمام جانداروں میں فضیلت حاصل ہے کیونکہ انسان دیکھتا ہے، سوچتا ہے اور پھر اظہار کرتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتا ہے اور اسے دوسرے انسانوں تک پہنچاتا ہے بلکہ وہ دیگر سماجی مسائل کے حوالے سے سوچتا ہے۔ ان کو پرکھتا ہے اور پھر ان کے حل کے لیے کوئی تدبیر نکالتا ہے۔ انسان جو کہ سماج کا اہم ترین حصہ ہے وہ معاشرے کے متعلق سوچتا ہے اسے خدا نے برابر کے حقوق دیے ہیں کیونکہ خدا کی نظر میں تمام انسان برابر ہیں لیکن ہمارے معاشرے نے اِسے مختلف طبقوں میں تقسیم کر دیا ہے جس طرح سماج میں معاشی حوالے سے طبقے قائم ہو چکے ہیں اور تمام وسائل ایک مخصوص طبقے کو دے دیے گئے ہیں بالکل اسے طرح اپنی سوچ، خیال اور رائے دوسروں تک پہنچانے کا حق بھی ایک مخصوص طبقے کو دے دیا گیا ہے۔ انسان چانکہ شعور رکھتا ہے اور اس شعور کی بناء پر وہ سوچتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ اپنی رائے معاشرے کے افراد تک پہنچائے اور نہ صرف اپنے مسائل بلکہ پورے معاشرے کے مسائل پر آواز اٹھائے اور اس سے دوسروں کو آگاہ کر دیں، لیکن ہمارے سماج میں ان آوازوں کو سننے والا کوئی نہیں۔ اِن افراد کو پہلے تو بولنے کا حق ہی نہیں دیا جاتا اور اگر یہ کسی بھی طرح سے اپنے اس حق کا استعمال کر بھی لیں تو سننے والا کوئی بھی نہیں ہوتا۔

جوؔن ایلیا اپنے انشائیے "حقیقتِ حال" میں معاشرے کی اسی خامی اور ناانصافی کو بیان کرتے ہیں اور سماج کے ان افراد کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ جوؔن کہتے ہیں کہ اس سماج میں تمام اففراد کو برابر کے حقوق حاصل ہیں کوئی کسی سے برتر یا کم تر نہیں۔ اِس لیے اس معاشرے میں موجود ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مسائل پر بولیں اور اپنی رائے دوسروں تک پہنچائے۔ چونکہ اس سماج میں ہر فرد یہ چاہتا ہے کہ وہ صرف بولے اور دوسرے سُنیں۔ اس لیے جوؔن معاشرے کے ان دانش وروں اور فنکاروں کو کہتے ہیں کہ وہ

معاشرے کے افراد کی آراءاور ان کے مسائل سُنیں کیونکہ بولناہر کوئی چاہتاہے لیکن سُنتا کوئی نہیں ہے۔اور جب یہ دانش ور غیر جانبدار ہو کر سب کی سنیں گے تو یہ با آسانی اس طبقے کی آواز بھی دوسروں تک پہنچا سکیں گے۔جس کی آواز اس معاشرے میں کوئی نہیں سُنتا۔چونکہ اس سماج میں دانش ور اور فنکاروں کو یہ صلاحیت حاصل ہے کہ وہ نہ صرف اپنی آواز بلکہ معاشرے کے تمام افراد کی آواز دوسروں تک پہنچاسکتے ہیں۔اور ان کے بولنے سے معاشرے میں بڑے پیمانے پر تبدیلی واقع ہوتی ہے اور ان کے بولنے سے یہی معاشرے میں کسی برائی کو ختم بھی کیا جاسکتاہے اور کسی برائی کو پھیلایا بھی جاسکتاہے۔

معاشعرے میں موجود تمام افراد ایک دوسرے سے الگ رائے رکھتے ہیں کیونکہ ہر انسان کے سوچنے کا انداز دوسرے انسان سے مختلف ہوتاہے لیکن معاشرے میں ایسے بہت سے افراد موجود ہیں جو اپنی رائے بیچ دیتے ہیں۔جوؔن ایلیا اپنے انشائیے "جو کہا گیا" میں ایسے ہی لوگوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔جوؔن کہتے ہیں کہ شاعر اور ادیب معاشرے کے وہ معزز افراد ہیں جو کہ اس کو بنانے اور بگاڑنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔لیکن یہی معزز لوگ اس وقت قابلِ صلاحیت بنتے ہیں جب یہ اپنی رائے کو بیچ دیتے ہیں کیونکہ وہ سوچ قابلِ احترام ہے جو کہ بغیر مفاد کے قائم کی جائے۔اس لیے جوؔن کہتے ہیں کہ وہ رائے جو انسان اپنی زاتی سوچ سے قائم کرتاہے وہ قابلِ احترام ہے چاہے وہ دوسروں سے نفرت کرنے کا ہی کیوں نہ سوچے۔کیونکہ یہ رائے اس انسان کی خود کی قائم کی ہوئی ہے،اس لیے جوؔن ان شاعروں اور ادیبوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں جو اپنی رائے بیچ کر صرف چند لوگوں کی خوشی کے لیے،ان کے مفاد کی خاطر اپنی رائے کو ان کی مرضی کے مطابق بدلتے ہیں اور پھر انہی کی منشا پر اس رائے اور اس سوچ کو کاغذ پر اتارتے ہیں۔اس طرح یہ لوگ قابلِ ملامت ہیں اور ادیب اور شاعر کہلانے کے حق دار نہیں کیونکہ یہ سوچ کو بیچ دیتے ہیں۔

اس حوالے سے جوؔن کچھ یوں لکھتے ہیں:

> میں آزاربدی کو زرخرید نیکی پر ترجیح دیتا ہوں۔نہ بِکا ہوا جھوٹ میرے نزدیک بِکے ہوئے سچ سے کہیں زیادہ قابلِ قدر ہے۔۔۔خیالات کی بولی لگانا کسی شریف آدمی کو ہر گز زیب نہیں دیتا۔اپنی ذاتی رائے رکھنا اور اس کا اظہار کرنا ایک قسم کی شرافت ہے،پر رائے کو بیچ ڈالنا انتہائی ذلالت ہے۔(۷)

انسانیت کی سب سے بڑی نیکی دانائی ہے اور دانائی کا سب سے اچھا وظیفہ کلام ہے۔ہر انسان عقل،فہم وفراست اور شعور رکھتاہے۔اور جب وہ کائنات کا مشاہدہ کرتاہے اور سماج کے مسائل پر غور و فکر کرتاہے تو

اس پر نہت سے حقائق آشکار ہوتے ہیں اور پھر وہ مختلف حوالوں سے اپنی آراء قائم کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ دوسرے اس کی آواز اور اس کے خیالات کو سُنیں، لیکن ہمارے سماج میں اظہارِ رائے پر پابندی عائد ہے۔ ہر فرد جو سوچتا ہے، جو رائے رکھتا ہے اسے اختیار نہیں کہ وہ سماج کے دیگر افراد تک یہ خیالات اور آراء پہنچا سکیں۔ جوؔن ایلیا اپنے انشائیے " آواز "میں اِسی اظہارِ رائے کی آزادی کے حوالے سے بات کرتے ہیں کہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جو رائے رکھتا ہے اس کا کھل کر اظہار کرے۔ لیکن ہمارے سماج میں چند افراد ایسے موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ دوسرے افراد اپنی رائے کا اظہار نہ کریں۔ یہ وہ افراد ہوتے ہیں جو کہ سچائیوں اور حقیقتوں کا سامنا نہیں کرسکتے یہ افراد سچائی کے سامنے آنے سے ڈرتے ہیں کیونکہ ان میں اعتماد کی کمی ہوتے ہے۔ اس لیے یہ نہیں چاہتے کہ ان کے اصل چہروں اوران کے جھوٹوں سے قوم واقف ہو لیکن چند افراد کی وجہ سے پوری قوم پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ اور جو لوگ اظہار کی آزادی پر پابندی لگاتے ہیں وہ دوسروں کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں۔ جوؔن مزید کہتے ہیں کہ موجودہ دور میں پہلے ہی عقل و شعور کی کمی پائی جاتی ہے صرف چند لوگ ہی عقل و شعور کھتے ہیں اور اسے استعمال کرتے ہے اگر ان سوچنے والے اور عقل و شعور رکھنے والے افراد کی بھی آوازوں کو دبا دیا گیا اور ان کے اظہار پر بھی پابندی لگادی گئی تو یہ معاشرہ مزید پستی کی طرف چلا جائے گا۔ اور کبھی ترقی نہیں کر سکے گا اور ہر ایک کی آوازوں کو اگر اسی طرح دبا دیا گیا تو پھر کبھی کئی سوچنے والا اس معاشرے میں موجود نہیں رہے گا۔

جوؔن اسی طرح کے خیالات کا اظہار اپنے ایک اور انشائیے " بیان "میں بھی کرتے ہیں۔ سوچنے اور رائے رکھنے کا اختیار اور حق معاشرے کے ہر فرد کے پاس ہے لیکن چند افراد یہ حق دوسروں سے چھین لیتے ہیں۔ وہ نہ صرف یہ حق ان سے چھین لیتے ہے بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ ان لوگوں کے متعلق فیصلے کرنے کا اختیار بھی انہیں مل جائے۔ اس لیے جوؔن کہتے ہیں کہ ایسے شخص کا کوئی وجود ہی نہیں جو اپنے فیصلے خود کرنے کا اختیار نہ رکھتا ہو اور اسی طرح وہ شخص جو اپنے متعلق فیصلے کرنے کا حق رکھتا ہے اور اس حق کو استعمال کرنے کا اختیار بھی رکھتا ہے اس کے باوجود وہ اپنی رائے کو اور اپنے فیصلوں کو دوسروں کو سپرد کر دیتا ہے وہ اپنی ذات سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ اس طرح جب دوسروں سے متعلق فیصلے کیے جاتے ہیں اور انہیں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں دیا جاتا تو ایکوقت ایسا آتا ہے کہ بغاوت کی صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے جو کہ معاشرے میں ایک بہت بڑے بگاڑ کا باعث بنتی ہے اور وہ شخص کبھی ترقی نہیں کر سکتا جو کہ اپنے حقوق کو پہنچانتے نہیں اور ان کو حاصل کرنے کے لیے کوشاں نہیں ہوتے۔

انسان جس طرح ایک دوسرے سے مختلف شکل و صورت رکھتا ہے اسی طرح وہ چیزوں کو دیکھنے کا زاویہ بھی مختلف رکھتا ہے۔ اس کے سوچنے کا انداز بھی مختلف ہوتا ہے اور کسی بھی معاملے میں اس کی آراء بھی دوسرے انسانوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس لیے معاشرے اور اس کے افراد کی بھلیائی اسی میں ہوتی ہے کہ اس سماج میں بسنے والے تمام افراد ایک دوسرے کی اراء اور سوچ کا احترام کریں لیکن جوؔن اپنے انشائیے "اعتماد" میں اسی بات کو حدفِ تنقید بناتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں دوسروں کی سوچ اور رائے کا احترام نہیں کیا جاتا۔ ہر شخص سمجھتا ہے کہ صرف وہی ٹھیک ہے اور وہ جو سوچ رکھتا ہے وہی سوچ درست ہے۔ اس طرح وہ خود کو ٹھیک اور دوسروں کو غلط ٹھہراتا ہے۔ اس طرح سماج کے مختلف گروہوں کے درمیان نفرت کی ایک دیوار کھڑی ہو جاتی ہے حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ ایک دوسرے کی رائے کا احترام کیا جائے۔ بحث و مباحثے کی فضا قائم کی جائے اور دلائل کے ساتھ تمام باتوں کو غلط ثابت کیا جائے اور دلائل کے ساتھ ہی آراء کو مسترد کیا جائے کیونکہ بحث و مباحثہ ذہن کی دانش مندانہ حالت کا نتیجہ ہے۔

اس سلسلے میں جوؔن ایلیاء کہتے ہیں:

> ایسا کیوں ہے کہ تم کسی بھی رائے اور کسی بھی خیال کے بارے میں اپنے سوا کسی دوسرے پر اعتماد کرنے کی کوئی بھی اہلیت نہیں رکھتے۔؟۔۔۔ایک ہی حق تو ہے جو تم بھی مانگتے ہو اور تمھارا حریف بھی مانگتا ہے اور وہ حق ہے رائے رکھنے اور اسے ظاہر کرنے کا۔ تم وہ رائے رکھو جو تمھیں درست معلوم ہوتی ہے اور دوسروں کو وہ رائے رکھنے کی آسانی فراہم کرو جو انھیں درست معلوم ہوتی ہو۔ (۸)

نوجوان کسی بھی قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں اور یہی نوجوان ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے اپنی ملک کو خوشحالی کی راہ پر گامزن کرتے ہیں۔ یہی وہ نوجوان طلبہ ہیں جو علم اور شعور کی روشنی رکھتا ہے اور ہر معاملے میں سوچ بچار کے بعد کوئی رائے قائم کرتا ہے لیکن جہاں سماج میں سوچ بچار کرنے والے نوجوان ہوتے ہیں اور شعور کو استعمال میں لا کر نہ صرف خود ترقی کرنا چاہتے ہیں بلکہ ملک و قوم کی تراقی میں بھی اپنا حصہ ڈالنا چاہتے ہیں وہیں چند افراد ایسے بھی موجود ہیں جو کہ شعور کی مخالفت کرتے ہیں اس لیے وہ ایسے نوجوان پر پابندیاں عائد کرتے ہیں جو علم و شعور کی دولت رکھتے ہیں اور اسے کام میں لاتے ہیں۔

جوؔن ایلیا اپنے انشائیے "طلبہ" میں اسی حوالے سے بات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ علم ایک ایسی دولت ہے جس کی اہمیت سے کسی دور میں بھی انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن شعور و آگہی سے ہر دور میں اختلاف رہا

ہے کیونکہ جب کسی معاملے پر نوجوان سوچ بچار کریں گے اور اپنے ذہن کی پرتیں کھولیں گے تو پھر وہ زمانے اور گروہوں کی اصل حقیقتوں سے روشناس ہوں گے اور جب وہ ان تمام حقیقتوں سے آگاہ ہو جائیں گے تو پھر وہ اس سماج کی ناانصافیوں اور ناہمواریوں کے خلاف آواز بلند کریں گے اس لیے ایسے نوجوان جو علم حاصل کرنا چاہتے ہیں، شعور کو بیدار کرنا چاہتے ہیں اور سوچ بچار کے بعد ہی کوئی رائے قائم کرنا چاہتے ہیں ایسے نوجوانوں پر درس گاہوں کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں کیونکہ یہ وہ نوجوان ہیں جنہیں علم نے انسانوں سے محبت کرنا سکھایا اس لیے ایسے نوجوان کو درس گاہوں سے دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کیونکہ سماج کے چند افراد کو یہ خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ اگر ان نوجوانوں نے علم حاصل کر لیا اور ان میں شعور کا اضافہ ہو گیا تو ان کی وہ سچائیاں سب کے سامنے آجائیں گی جنہیں وہ ابھی تک چھپائے ہوئے ہیں اسی لیے ایسے نوجوانوں پر علم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں جو سوچنا اور محسوس کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنے حقوق کو پہچان نہ پائیں۔

جوآن ایلیاء کے مطابق:

> کتنی عجیب بات ہے کہ ان نوجوانوں پر علم کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی عقل سے کام لیں اور جو چاہتے ہیں کہ علم سے نفس کی تزیہہ اور احساس کی تطہیر کا کام لیں۔ جنھیں علم نے انسانوں سے محبت کرنا سکھایا ہے، شاید ان سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ سوچنا اور محسوس کرنا چھوڑ دیں۔ اس لیے کہ سوچنے اور محسوس کرنے کے بہت سے رُخ ہیں اور اس طرح وہ سچائیاں سامنے آتی ہیں جنہیں کچھ لوگ چھانا چاہتے ہیں۔[۹]

اس کے ساتھ ہی جوآن یہ بھی کہتے ہیں کہ ان نوجوانوں کے علم حاصل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں جو پہلے سے کئی رائے قائم کر لیتے ہیں اس کے بعد علم حاصل کرنے کے لیے درس گاہوں کا رُخ کرتے ہیں۔ بغیر جانے پرکھے کسی بھی بات پر یقین کر لینا علم کے منافی ہے اور پھر ایسے نوجوانوں کی رئے علم حاصل کرنے سے بھی نہیں بدلتی اس لیے ایسے نوجوانوں کے علم حاصل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

ادب اور زندگی کا تعلق بہت گہرا ہے۔ یہ زندگی کا عکاس ہے۔ انسانی زندگی میں جو بھی معاملات اور مسائل درپیش ہوتے ہیں وہ سب ادب میں بیان کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انسانی جذبات و احساسات اور خیالات بھی اس میں بیان کیے جاتے ہیں۔ ہر دور کا ادب اس دور کی معاشرت، تہذیب، ثقافت، رسم و رواج اور رجحانات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کسی دور کے حالات ہم اس دور کے ادب سے جان سکتے ہیں سماج کے حوالے

سے اگر ادب کی بات کی جائے تو ہر دور کے ادب میں اس دور کی خوبیاں اور خامیاں دونوں بیان کی جاتی ہیں کیانکہ سماج خوبیوں اور خامیوں کا مرکب ہوتا ہے جہاں اچھائیاں ہوتی ہیں وہاں کہیں نہ کہیں برئی بھی جنم لیتی ہے۔ اس لیے ادب میں اس دور کی برائیاں اس لیے بیان کی جاتی ہیں تاکہ اس برائی کو اس معاشرے سے ختم کیا جاسکے اور اسی طرح اچھائیاں بیان کرنے کا مقصد بھی یہ ہوتا ہے کہ اس سے معاشرے کے دیگر افراد متاثر ہوں اور وہ بھی ان اچھی باتوں کو اپنائیں لیکن قدیم دور کی نسبت دورِ جدید میں ادب میں توازن نہیں رہا۔

جوؔن ایلیا اپنے انشائیے "بادِرات" میں ادب کی اسی بے اعتدالی کی بات کرتے ہیں کہ اب ادب میں صرف سماج کی برائیاں ہی بیان کی جاتی ہیں۔ جوؔن کہتے ہیں کہ گزشتہ ادوار میں ادیب اعتدال و توازن سے کام لیتے تھے۔ لیکن اب ادب میں صرف معاشرے کی تمام برائیوں کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔ اور نیکیوں اور اچھائیوں کو پسِ پُشت ڈال دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے شاعری کو ایک پیشہ بنالیا ہے اور اس میں نام پیدا کرنے اور خود کو بڑا ثابت کرنے کی دوڑ میں لگ گئے ہیں اور یہ بات بھول گئے ہیں کہ شاعری زندگی کے حُسن کو بیان کرنے کا نام ہے لیکن آج ہم نے اسے صرف دکھوں کی زبان بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جوؔن یہ بھی کہتے ہیں کہ جب شاعری ایک پیشہ نہیں تھا تب اس میں دل کا درد اور کرب دیکھا جاتا تھا لیکن اب یہ ایک پیشے کی صورت اختیار کر گئی ہے اس لیے اس میں اب صرف کارکردگی دیکھی جاتی ہے، دل کا کرب نہیں دیکھا جاتا اور جوؔن کے نزدیک شاعری ہرگز کوئی پیشہ نہیں ہے۔

اہلِ علم قوموں کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ قوم کے احساسات و جذبات کو محسوس کرتے ہیں، اس کی تمناؤں اور آرزوؤں کا ادراک رکھتے ہیں اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے خود بھی سر گرمِ عمل ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی سر گرمِ عمل کرتے ہیں۔ اہلِ قلم کے زمرے میں ادیب بہت اہم حیثیت رکھتا ہے۔ وہ قوم کے احساسات و جذبات کو بہت شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ ادیب چونکہ حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔ اس لیے وہ معاشرے کے اتار چڑھاؤ کو دیگر افراد کی نسبت زیادہ شدت سے محسوس کرتا ہے۔ چونکہ یہ ایک مثالی معاشرے کا خواب دیکھتا ہے، وہ معاشرے کی تمام برائیوں کو ختم کرنا چاہتا ہے اس لیے وہ ان تمام مسائل اور برائیوں پر کُڑھتا ہے اور پھر وہ ان مسائل کو اپنی فکر کے ذریعے تحریر کرتا ہے تاکہ ان تمام برائیوں کا خاتمہ کرکے ایک مثالی معاشرہ قائم کیا جاسکے۔

کسی بھی معاشرے کے دانش ور اور ادیب وہ افراد ہیں جو سب سے زیادہ قابلِ احترام ہیں کیونکہ یہ بناءِ غرض کے عوام کے بارے میں سوچتے ہیں ان کی بھلائی کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ ان کے دکھوں کو اپنا

دکھ سمجھ کر انہیں اپنی تحریروں میں بیان کرتے ہیں۔ یہ علم و شعور کا پیکر ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر دور میں ان لوگوں کو عزت دی گئی، یہاں تک کہ اسلام کے دورِ عروج میں بھی اہلِ قلم کو بہت اہمیت دی گئی اس کے بعد سے لے کر گزشتہ ادوار تک ان کو عزت و احترام سے نوازا گیا، لیکن موجودہ دور میں اِن ادیبوں اور دانش وروں کو وہ اہمیت نہیں دی جارہی جو ان کا حق ہے۔ موجودہ دور صنعتی ترقی کا دور ہے۔ اس دور میں ہر ایک شخص ان لوگوں کو اہمیت دیتا ہے جو انہیں کسی نہ کسی طرح مالی فائدہ پہنچاتا ہے۔ ادیب چونکہ ان لوگوں کے لیے مالی فائدے کا باعث نہیں بنتا اس لیے ان کا مناسب مقام نہیں دیا جارہا۔

جوؔن ایلیا اپنے انشائیے "سماج اور دانش ور "میں اسی موضوع کے حوالے سے بات کرتے ہیں کہ ادیب جو کہ معاشرے میں زیادہ عزت کے قابل ہوتے ہیں انہیں ان کا صحیح مقام نہیں دیا جارہا۔ موجودہ دور علم و دانش کی کمی کا دور ہے۔ پہلے لوگ شعور رکھتے تھے اور علم کی اہمیت سے آگاہ تھے۔ اس لیے علم و شعور رکھنے والے لکھاریوں کو اہمیت دیتے تھے لیکن اب ہر ایک صرف مالی فائدہ حاصل کرنے کی فکر میں پڑا ہوا ہے۔ اسے جہاں مالی فائدہ نظر آئے اس طرف اس کا جھکاؤ ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ادیبوں کے بجائے اداکاروں، لطیفہ گوہوں اور مسخروں کو اہمیت دیتا ہے کیونکہ یہ ان کی تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ جوؔن کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے جینے کا معیار ہی گرا دیا ہے اور جب ہم اپنے جینے کے معیار کو اس قدر پست کر دیں گے تو ہم کبھی بھی صحیح لوگوں کو ان کا مقام نہیں دے پائیں گے اور صرف ان چیزوں کو اپنائیں گے جو کسی بھی طرح ہمارے لیے فائدہ مند ہے یہی تمام باتیں جوؔن اپنے دیگر انشائیوں میں بھی کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی جوؔن کہتے ہیں کہ اس حقیقت کو جھُٹلایا نہیں جا سکتا کہ جہان موجودہ دوعر میں بہت قابل لکھنے والے موجود ہیں وہیں چند ایسے لکھاری بھی اپنا وجود رکھتے ہیں جن کے پاس علم کا ذخیرہ نہیں ہے لیکن پھر بھی وہ کئی کتب کے خالق ہیں۔ ہر شعبہ ریاض چاہتا ہے اوراس کے بغیر کوئی بھی ادیب اور شاعر نہیں بن سکتا لیکن ہمارے ادیب اور شاعر ایک سطر پڑھے بغیر ہی آٹھ دیوانوں اور دس کتابوں کے خالق بنے ہوئے ہیں۔ یہ خود کو اردو زبان کے اہلِ قلم میں شمار کرتے ہیں لیکن ان کا اپنا املاء ہی درست نہیں ہوتا۔ اس لیے ایسے قلم کاروں کو سماج سے کسی قسم کی کوئی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔

علم و شعور ایک ایسی دولت ہے جس کے باعث انسان کو دیگر جانداروں کے مقابلے میں فضیلت دی گئی۔ خود خدا نے بھی یہ ارشاد فرمایا کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر صرف علم و فضیلت کے باعث برتری حاصل ہے۔ اس لیے اسلام کی تعلیمات کے مطابق علم و فضیلت کا معیار دولت نہیں ہے لیکن ہمارے سماج

میں اب صرف دولت کو ہی اہمیت دی جاتی ہے۔، اس لیے جوؔن کہتے ہیں کہ پہلے بڑائی اور فضیلت کی بنیاد علم و فضل پر تھی اور جس کے پاس جس قدر دانش، علم اور حکمت زیادہ ہوتی اسی قدر وہ قابلِ احترام اور بڑا سمجھا جاتا تھا لیکن اب فضیلت علم کی بنیاد پہ نہیں رہی بلکہ مال و دولت اور روپیہ پیسہ ہی بڑائی کی بنیاد ہے اور آج کے دور میں انسان علم کی دولت کے بجائے اپنے نسب اور دولت سے پہچانا جاتا ہے اور یہ تمام معیارات ہمارے اپنے پیدا کردہ ہیں اور انسان اپنی دولت اور نسب کے غرور میں دوسرے انسانوں کو خود سے کم تر سمجھتا ہے۔ اور اس کے ضرر پہنچاتا ہے حالانکہ یہ تمام معیارات کچھ بھی نہیں۔

جوؔن ایلیاء کہتے ہیں:

> اصل فضیلت ادب ہے، دانش ہے، نسل اور نسب کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔ مگر ہم ہیں کہ ہم نے نسل پرستی اور نسب کے غرور کو اپنا ایمان بنا رکھا ہے۔[۱۰]

اسی طرح جب علم و فضل کو اہمیت نہیں دی جاتی تو لوگ اپنی کم علمی کی بناء پر ایسے لوگوں کو اہمیت دیتے ہیں جو کسی بھی طرح سے اس کے قابل نہیں ہوتے اور ایسے لوگوں کو اپنا مسیحا سمجھتے ہیں جو ان کی بھلائی، اور انہیں ترقی دینے کے بجائے انہیں پستی کی طرف دھکیلتے ہیں کیونکہ یہ ان کے مفاد کے بجائے صرف اپنے مفاد کے بارے میں سوچتے ہیں۔ جوؔن اپنے انشائیے "میزانیہ "میں ایسے ہی لوگوں کی کم علمی کو بیان کرتے ہیں جو کہ اپنے رہنماؤں پر یقین کر لیتے ہیں یہ ان کے مسیحا ہونے کے دعوے دار تو ہیں لیکن یہی صرف قوم کو بھٹکانا چاہتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ اپنی کم علمی کی بناء پر ایسے لوگوں کو اقتدار سونپ دیتے ہیں جو اس قبل نہیں ہوتے اور ایسے لوگوں کو پہچان نہیں پاتے جو دانش اور شعور رکھتے ہیں اور وہی اقتدار کے قابل ہیں لیکن عوام اپنی کم علمی کی بناء پر بہت سارے ایسے غلط فیصلے کرتے ہیں جو نہ صرف ان کے لیے بلکہ اس ملک کے لیے بھی خسارے کا باعث بنتے ہیں اس لیے ہمیشہ ایسے لوگوں کو عزت دینی چاہیے جو کہ علم و شعور رکھتے ہیں۔

جوؔن ایلیا کا شمار نہ صرف اردو ادب کے ادیبوں میں ہوتا ہے بلکہ یہ اردو کے نامور شاعر بھی تھے۔ اور ان کی شاعری کے بہت سے مجموعے شائع ہو کر قارئین تک پہنچ چکے ہیں۔ جوؔن خود بھی شاعر تھے اور ان کے دوست بھی ادب سے تعلق رکھتے تھے جن میں نہ صرف شعراء بلکہ ادباء بھی شامل تھے۔ جوؔن اپنے انشائیے "وقت، وقت، وقت "میں اپنے ان دوستوں کا ذکر کر رہے ہیں جو یکے بعد دیگرے اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ جوؔن کہتے ہیں کہ یہ دور ہم لکھاریوں کے لیے جو کہ سماج کی ناہمواریوں کو دل سے محسوس کرتے ہیں

اور ان پر قلم اُٹھاتے ہیں۔ انتہائی تکلیف دہ زمانہ ہے کیونکہ اس زمانے میں معاشرتی تکالیف ایک طرف ادب کے لکھاریوں کا یوں اس دنیا سے چلے جانا بہت دکھ کی بات ہے۔

جوؔن امروہہ میں پیدا ہوئے تھے اور قیامِ پاکستان کے کچھ عرصہ بعد ہجرت کر کے کراچی منتقل ہو گئے۔ امروہہ میں اور کراچی منتقل ہونے کے بعد بھی انہیں تنہائی کا احساس بہت شدت سے ستاتا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب وہ خود کو اکیلا محسوس کرتے تھے لیکن پھر ان کے کچھ دوست ان کے اس اکیلے پن کو ختم کرنے کا سبب بنے۔ جوؔن اپنے انشائیے "کمائی" میں اپنے انہی دوستوں کا ذکر کرتے ہیں جو کراچی منتقل ہونے کے بعد ان کے ساتھ رہے لیکن پھر ان کے کچھ دوست ان سے بچھڑ گئے اس لیے جوؔن کہتے ہیں کہ دوست زندگی بھر کی کمائی ہوتے ہیں۔ چونکہ انسان کے دکھ درد کے ساتھی ہوتے ہیں اس لیے انہیں ہمیشہ سنبھال کر رکھنا چاہیئے۔ اگر ان سے کسی بات پر اختلاف ہو بھی جائے تو اس اختلاف کو فوراً ختم کر دینا چاہیے اس لیے جوؔن اپنے انہی دوستوں کو زندگی بھر کی کمائی کہہ رہے ہیں کیونکہ اس اکیلے پن میں یہی ان کے ساتھی تھے۔

پاکستان کے حصول کے لیے سب نے مل کر بہت جدوجہد کی اور بہت ساری قیمتی جانیں بھی اس مقصد کے لیے گنوا دیں۔ اور بالآخر آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن آزادی جیسی نعمت حاصل کرنے کے بعد ہم نے صرف چند محدود میدانوں میں ترقی کی۔ مادی لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو نئے تعلیمی ادارے قائم کیے گئے۔ قصبے شہروں میں تبدیل ہو گئے۔ اس طرح مادی لحاظ سے ہم کئی قدم آگے بڑھے لیکن نظریاتی لحاظ سے ہم اتنے سال گزر جانے کے باوجود آج بھی وہیں کھڑے ہیں۔ ہم اپنی پہچان پاکستانی ہونے کے بجائے علاقائی بنیادوں پر کراتے ہیں۔ ہم اگر کسی مسئلے پر غور کریں یا ترقی کے لحاظ سے سوچے تب بھی ہم علاقائی بنیادوں پر ہی سوچے اور ترقی لے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ ہم نے خود کو گروہوں اور علاقوں میں تقسیم کر دیا ہے اور جب ہم نے خود کو گوہوں اور علاقوں میں تقسیم کیا اور اسی تقسیم کے حوالے سے آگے بڑھے تو ہم نے اپنے درمیان صرف نفرتوں کو جنم دیا۔ ایسی نفرت جو کہ ختم یا کم ہونے کے بجائے دن بدن بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

جوؔن اپنے متعدد انشائیوں میں اسی گروہی اور علاقائی تقسیم کے حوالے سے بات کرتے ہی۔ جوؔن کہتے ہیں کہ ہم نے اس ملک کو اس لیے حاصل کیا تاکہ یہاں سب مل جل کر رہیں لیکن ہم نے خود کو علاقائی بنیادوں پر تقسیم کر دیا ہے جس کی وجہ سے آپس میں نفرتیں قائم ہو چکی ہیں۔ یہ نفرتیں پیدا کرنے والے اصل میں حکمران ہیں اور اس کے ساتھ وہ طبقہ جو غریبوں کے حقوق عقب کرتے ہیں۔ ان کی یہ نفرتیں پھیلانے کی

وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ نہیں چاہتے کہ اس ملک کے عوام اپنے حقوق کو پہچانے اور اس کے لیے آواز بلند کریں۔اس لیے یہ انہیں علاقائی اور لسانی جھگڑوں میں الجھا دیتے ہیں تا کہ یہ اپنے اصل مسائل کو نہ پہچانے اور ان جھگڑوں میں الجھے رہے اور آپس میں لڑتے رہیں۔

جوؔن ایلیاء اپنے انشائیہ "حتمی" میں حکمرانوں کے اسی رویے کو یوں بیان کرتے ہیں:

> سُن لو!وہ ایسی باتیں کر رہے ہیں جو غریبوں اور مظلوموں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے نفرت دلائیں۔سندھی اور غیر سندھی کا جھگڑا آخر کیوں کھڑا کیا گیا ہے،اس لیے کہ سندھی اور غیر سندھی غاصب،سندھی اور غیر سندھی غریبوں کو ایک دوسرے سے لڑوا کر اپنا حساب درست رکھنا چاہتے ہیں یہی ان کی سیاست ہے اور یہی ان کی حکمت۔[۱۱]

علاقائی بنیادوں پر تقسیم کے علاوہ جوؔن لسانی جھگڑوں اور نفرتوں کا ذکر بھی کرتے ہیں اور لسانی حوالے سے خاص کر سندھی اور اردو زبان کا جھگڑا اس وقت وجود میں آیا جب آزادی کے بعد ہندوستان سے بہت بڑی تعداد میں مہاجر آ کر سندھ میں آباد ہوئے۔یہ مہاجر چونکہ زیادہ تعلیم یافتہ تھے اس لیے انہوں نے سندھ میں آ کر فکری اور تجارتی شعبوں میں بہت مہارتیں دکھائی اور ہندوؤں کی جگہ لے لی۔ان مہاجروں کی اس ترقی سے سندھی عوام کے دلوں میں نفرت کا بیج بو دیا گیا۔ان مہاجروں کی زبان اردو تھی اس لیے ان سے نفرت کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی زبان سے بھی نفرت کی جانے لگی۔اس طرح اس نفرت کی فضا کو وجود میں لانے اور اسے پروان چڑھانے میں جاگیر دار طبقے کا بہت بڑا حصہ ہے اور پھر اس نفرت اور کشیدگی سے اس طبقے نے بہت فائدہ اٹھایا اور یوں اردو اور سندھی زبان کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔

جوؔن ان تمام باتوں کو اپنے انشائیے "سندھی اردو" میں بیان کرتے ہیں کہ سندھی اور اردو زبان کا مسئلہ انتہائی نازک مسئلہ ہے جس کا حل نکالنا بہت ضروری ہے کیونکہ اس مسئلے کو لے کر لوگوں کے دلوں میں نفرتیں پیدا کی جا رہی ہیں۔محبت اس دور میں مفقود ہو چکی ہے۔تمام سندھی اور اردو بولنے والوں کے درمیان نفرتیں پیدا کی جا رہی ہیں۔ان تمام ہنگاموں کو صرف وہی لوگ برپا کر رہے ہیں جو ملک کی ترقی میں رکاوٹیں کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔جو مظلوموں اور غریبوں کو ان کے حقوق سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔اس لیے وہ ہر ایک کو زبان کے مسائل میں اُلجھا کر انہیں غلط راستے پر چلانا چاہتے ہیں تا کہ وہ صحیح راستے پر نہ چل سکے اور اپنے حقوق کا صحیح ادراک کر کے اپنے حقوق کے حصول کے لیے آواز بلند نہ کر سکے۔

جوّن اسی حوالے سے مزید کہتے ہیں کہ اس نفرت کو بڑھاوا دینے والے اوراس کو پیدا کرنے والے صرف سندھی زبان سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ یہ لوگ سندھی اور اردو دونوں زبانوں سے تعلق رکھنے والے ہیں جہاں سندھی زبان سے تعلق رکھنے والے افراد میں ظالم اور غاصب موجود ہیں وہیں اردو زبان سے تعلق رکھنے والے افراد میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں۔اس لیے اس مظلوم طبقے کو آپس میں لڑنے کے بجائے ان ظالموں اور غاصبوں سے لڑنا چاہئے۔اور ان کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے۔علاقوں اور زبانوں کا جھگڑا بھی اسی لیے پیدا کیا گیا ہے تاکہ غریب سندھی اور غریب غیر سندھی آپس میں لڑیں اور غاصب ان حالات سے فائدہ اٹھائیں۔اس لیے جوّن کہتے ہیں کہ ایک جنگ ایسی ہونی چاہیے جو کہ تمام مظلوم غاصبوں سے کریں تاکہ ان کے درمیان موجود نفرتوں کو یہ مزید بڑھاوانہ دے سکیں۔

اس کے ساتھ ہی جوّن اپنے انشائیے "حساب" میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں لیکن اس میں وہ مزید یہ بھی کہتے ہیں کہ ہماری زندگی مختصر سی ہے اور اس زندگی میں بہت سے ایسے دوسرے مسائل ہیں جو توجہ طلب ہیں لیکن ہم ان دیگر مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔اس لیے ان نفرتوں اور جھگڑوں کو ختم کر کے اصل مسائل پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔اور یہ زبان کا مسئلہ صرف ایک ہی صورت میں حل ہو سکتا ہے کہ سندھی زبان کے دانش ور، ادیب اور مفکر اس سلسلے میں سندھی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کریں اور عوام کو اس مسئلے کے حل کے لیے آمادہ کریں اور اس مسئلے کا حل صرف یہی ہے کہ سندھ میں دو زبانوں کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا جائے یعنی کہ سندھی اور اردو۔تب جا کر یہ مسئلہ حل ہو گا اور قوم اپنے اصل مسائل کی طرف توجہ دے سکیں گی اور ترقی کر سکے گی۔

انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا گیا اور اسے تمام جانداروں میں فضیلت دی گئی کیونکہ یہ شعور رکھتا ہے اس کے پاس علم ہے جس کی بناء پر وہ اچھائی اور برائی میں تمیز کرتا ہے۔دوسروں کے حقوق اور اپنے فرائض سے آگاہ ہوتا ہے اور یہ ایک ایسا معاشرہ قائم کر سکتا ہے جہاں امن و سکون ہو لیکن اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو انسان کو دوسرے جانداروں سے افضل تو قرار دیا گیا ہے لیکن یہ جانوروں سے زیادہ خطر ناک مخلوق ہے۔جانور کم از کم اپنے ساتھی جانوروں پر حملہ نہیں کرتے لیکن انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے خون کا پیاسا ہے۔اسے ہر طرح سے نقصان پہنچانے کے درپے رہتا ہے۔ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لیے دوسروں کے حقوق چھینتے ہیں حالانکہ انسان کی یہ زندگی مختصر ہے۔وہ اتنا نہیں سوچتا کہ اس محدود زندگی میں وہ بہتر طریقے سے دوسرے انسانوں کے ساتھ زندگی گزارے۔اس کے حقوق پورے

کرے، محبت کو قائم کرے۔ انسان کی ضروریات صرف اس کی بنیادی ضرورت یعنی کہ خوراک اور پانی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ دوسرے انسانوں سے پیار محبت سے پیش آئے۔ اس کے ساتھ بہت انداز میں مل جل کر زندگی گزارے۔

اس حوالے سے طارق محمود مغل اپنی کتاب "معاشرتی نفسیات" میں لکھتے ہیں:

> انسان کا سب سے بڑا مسئلہ حیاتیاتی بقاء کا نہیں، بلکہ آج کے انسان کو اس بات کی تعلیم دینے کی ضرورت ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ کس طرح بہتر طور پر زندگی بسر کر سکتا ہے۔[۱۲]

انسان شعور رکھنے کے باوجود دوسروں کو ضرر پہنچاتا ہے، اس لیے جوآن اپنے انشائیے "محبّت" میں کہتے ہیں کہ انسان اپنے تمام معاشی مسائل اس وقت تک ختم نہیں کر سکتا جب تک وہ اپنے درمیان محبت کو قائم نہیں کرتا۔ جوآن کہتے ہیں کہ محبت لوگوں کے درمیان ختم ہو گئی ہے۔ انسان صرف ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ اِن تمام برائیوں کے ساتھ ہی جھوٹ کی برائی بھی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اِس سماج میں اب ایک ایسی صورتِ حال قائم ہو چکی ہے کہ کسی کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا کیونکہ یہاں صرف ہر شخص جھوٹ کا سہارا لے کر ہی اپنی زندگی گزار رہا ہے۔ دلوں میں نفرتیں جنم لے چکی ہیں اور یہ نفرتیں اِس طرح بڑھ رہی ہیں کہ اس کے سبب ہر ایک دوسرے کا بُرا چاہتا ہے جس کی وجہ سے معاشرے کا امن و سکون تباہ و برباد ہو کر رہ گیا ہے۔

جوآن کہتے ہیں کہ محبت وہ جذبہ ہے جو نفرتوں کو ختم کر دیتا ہے اِس سے دشمن کو بھی دوست بنایا جا سکتا ہے۔ معاشرے کے تمام مسائل اس سے حل ہو جاتے ہیں اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے گا جو کہ مثالی معاشرہ کہلائے گا جہاں یہ تمام برائیاں موجود نہیں لوگی جس سے نہ صرف فرد بلکہ معاشرہ بھی ترقی کرے گا۔

جوآن معاشرتی برائیوں کا ذکر کرنے اور محبت قائم کرنے کی ترغیب دینے کے ساتھ ساتھ ایسے لوگوں کا ذکر بھی کرتے ہیں جو صرف معاشرے میں بگاڑ دیکھنا چاہتے ہیں۔ جوآن کہتے ہیں دنیا میں جہاں انسانیت دوست افراد موجود ہوتے ہیں وہیں ایسے افراد بھی کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں جو انسانوں کے دشمن ہوتے ہیں جو چاہتے ہیں کے معاشرے میں امن و سکون قائم نہ ہو۔ ایسے افراد نہ صرف مشرق میں بلکہ مغرب میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اور ایسے افراد ہر جگہ یہی ناقابلِ برداشت ہوتے ہیں۔ یہ افراد تمام لوگوں کو آپس میں لڑانے کا کام کرتے ہیں کبھی انہیں مذہب کے نام پر لڑاتے ہیں تو کبھی زبان کے مسائل کھڑے کر کے انہیں

ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔ یہی لوگ چاہتے ہیں کہ عوام اپنی آزادی، استحکام، حُبِ وطنی اور سماج سالمیت سے یکسر دستبردار ہو جائیں کیونکہ اگر ملک کے عوام اپنی زبان، تہذیب اور وطن کی محبت سے بیگانہ ہو جائیں گی تو اس کا فائدہ اسے سماج دشمن عناصر کو ہو گا اس لیے جوؔن کہتے ہیں کہ ایسے لوگوں سے بچنا چاہیے اور جو قومیں ایسے لوگوں کو بُرا کہتی ہیں ان کا احترام کرنا چاہیے اور سب کا یہ فرض ہے کہ وہ بھی اِن لوگوں کو بُرا کہے کیونکہ یہ قوم کے غدار ہیں۔

جوؔن سماج میں موجود نفرتوں کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ اس نفرت کا بھی ذکر کرتے ہیں جو بہت سالوں سے دو ممالک میں موجود ہیں اور یہ نفرت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہونے یا ختم ہونے کی بجائے دن بدن بڑھتی چلی جارہی ہے۔ یہ نفرت پاکستان اور بھارت کے درمیان موجود ہے۔ یہ دونوں ہمسائے ممالک ہیں۔ اور ان کے درمیان نفرت کے بجائے محبت ہونی چاہیے لیکن ان کے درمیان محبت کے بجائے نفرت ہے اور اس نفرت کی وجہ تقسیم سے پہلے پاکستان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیاں ہیں۔ جوؔن اِن کے درمیان نفرت کا ذمہ دار انگریزوں کو ٹھہراتے ہیں کیونکہ جب برصغیر میں ہندو اور مسلمان اکٹھے رہتے تھے تب انگریزوں نے تمام مراعات ہندوؤں کو دے رکھی تھی۔ مسلمانوں سے اِن کے حقوق چھین لیے گئے تھے۔ اسی طرح مسلمانوں کو ہندوؤں سے کم تر سمجھا جاتا تھا اور تمام فیصلے ہندوؤں کے مفاد میں کیے جاتے تھے اِس کی سب سے بڑی مثال تقسیم کے وقت مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیاں ہیں۔ اور ہندو بھی مسلمانوں سے نفرت کرتے تھے اور یہ نفرت آج تک قائم ہے۔

جوؔن اپنے انشائیے "تاریخ کی نکوئی" میں اِسی نفرت کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس نفرت کی وجہ سے یہ دونوں ممالک اپنا اپنا الگ وطن حاصل کر کے بھی چین کی زندگی بسر نہیں کر پا رہے اور آج تک ہر معاملے پر یہ دونوں ممالک ایک دوسرے سے الجھ پڑتے ہیں اور کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ پاتے اور اسی نفرت کی وجہ سے دونوں ممالک میں بہت سی جنگیں بھی ہوئیں۔ اِس لیے جوؔن کہتے ہیں کہ دونوں ممالک کو یہ سوچنا چاہیے کہ اِس نفرت نے انہیں آج تک کچھ نہیں دیا بلکہ یہ نفرت ان کی ترقی کی راہ میں ہمیشہ حائل ہوئی اِس لیے انہیں اس نفرت کو ختم کر کے محبت کی فضا کو قائم کرنا چاہیے۔ اِس کے ساتھ ہی جوؔن اپنی ایک اور انشائیے میں کہتے ہیں کہ اتنے سالوں کی نفرت کے باوجود اب اِن دونوں ممالک کے درمیان نفرت کی دیواریں گر رہی ہیں اور نفرت کم ہو رہی ہے جس کے نتیجے میں اِن دونوں ممالک نے ایک دوسرے کے لیے اپنے ملک کے دروازے کھول دیے ہیں اور امید کی جارہی ہے کہ ایک دن یہ نفرت مکمل طور پر ختم ہو جائے گی۔

انسان کو علم کی بناء پر افضل قرار دیا گیا لیکن انسانوں اور جانوروں میں ایک بات مماثلت رکھتی ہے کہ اِن دونوں کی بنیادی ضرورت خوراک ہے۔ جانوراپنی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے دوسرے جانوروں کو شکار کرتے ہیں جبکہ انسان اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے محنت کرتا ہے اور محنت کر کے دولت کماتا ہے تاکہ وہ خوراک حاصل کر سکیں لیکن دولت کے حصول لے لیے وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کو ضرر پہنچاتا ہے۔ وہ اس دولت کو حاصل کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتا ہے یہاں تک کہ آج وہ دور آچکا ہے کہ انسان کی قیمت لگائی جاسکتی ہے۔ انسان بھی ایک مالِ تجارت بن چکا ہے۔ انسان کے ہنر کی قیمت لگائی جاتی ہے۔ اور انسان نے ایسے بہت سارے حربے ہنر کے طور پر ایجاد کر لیے ہیں جس کے بل پر ہو زیادہ دولت حاصل کر لیتا ہے۔ اگر ایک انسان معذور ہے یا وہ بینائی سے محروم ہے تو اس محرومی کو بھی وہ ہنر کے طور پر استعمال کرے گا اور یوں اس کی قیمت بھی لگائے گا۔

جوآن ایلیا اپنے انشائیے "برزخ" میں انسان کی اسی بے حسی کا ذکر کرتے ہیں کہ انسان نے خود کو کس قدر پست کر دیا ہے۔ اس کا مقام کیا تھا اور اس نے اپنے مفاد کے لیے اپنی ہی قیمت لگانا شروع کر دی ہے۔ اس کے ساتھ جوآن یہ بھی کہتے ہیں کہ انسان کے ہنر کی قیمت لگانا تو ایک طرف انسان کے خون کی قیمت نہیں رہی۔ پہلے اگر کسی انسان کا خون بہایا جاتا تھا یا اسے قتل کر دیا جاتا تھا تو یہ ایک بہت بڑی بات تصور کی جاتی تھی لیکن اب انسان کے خون کو پانی کی طرح بہا دیا جاتا ہے اور درجنوں انسان کے مرنے کے بعد بھی اب یہ معمولی بات معلوم ہوتی ہے۔ یہ سب تو ایک طرف اب انسان اس قدر بے حس ہو چکا ہے کہ دوسرے انسانوں کا خون بہا کر اس پر نادم ہونے کے بجائے اس پر جشن مانا تا ہے۔ انسانیت اس سماج کے افراد میں سے ختم ہو چکی ہے۔

جوآن کہتے ہیں کہ جانور اپنی خوراک کے حصول کے لیے جب دوسرے جانوروں کو ہلاک کرتا ہے تو وہ اس پر جشن نہیں مناتا اور نہ ہی خوش ہوتا ہے کیونکہ یہ بے حس نہیں ہوتا۔ یہ انسان ہی ہے جو دوسروں پر ظلم کرتا ہے۔ انہیں تکالیف سے دوچار کرتا ہے اور وہ اس پر شرمندہ ہونے کی بجائے اس پر فخر محسوس کرتا ہے اور جشن مناتا ہے۔ یہ بہت افسوس کی بات ہے کہ انسان عقل اور شعور رکھنے کے باوجود بھی دوسروں کے ساتھ اس قسم کا سلوک رکھتا ہے۔ ہمارا معاشرہ اس مقام پر پہنچ چکا ہے کہ اس کے اندر سے انسانیت بلکل ختم ہو چکی ہے۔ دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کرنے اور ان کے کام آنے کے بجائے انہیں طرح طرح سے نقصان پہنچایا جاتا ہے۔

جوآن ایلیاء کے مطابق:

> انسان اس دنیا کو اپنے جرائم اور مظالم کے ذریعے جہنم بنا کر کوئی ندامت محسوس نہیں کرتا، بلکہ اس پر مسکراتا، ہنستا اور ٹھٹھے لگاتا ہے۔ وہ اپنی نوع کے لوگوں کو نیست و نابود کر کے کس قدر فخر محسوس کرتا ہے۔ فتح کے جشن مناتا ہے۔ جانور اپنے حریف جانور کو ہلاک کر کے فتح کے جشن نہیں مناتے۔[۱۳]

اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو انسان دانائی، عقل اور شعور کا مالک ہے۔ وہ شعور رکھتا ہے۔ علم کا ایک ذخیرہ اس کے پاس موجود ہے لیکن اس سب کے باوجود وہ انسانیت سے محروم ہے۔ اس نے علم تو حاصل کر لیا ہے لیکن انسانیت اسے کسی نے نہیں سکھائی اور جب تک اس کے اندر انسانیت پیدا نہیں ہو گی وہ ان تمام برائیوں سے دور نہیں ہو گا اور دوسروں کے دکھ، درد اور تکالیف کو محسوس نہیں کرے گا تب تک اس کی یہ عقل اور اس کا یہ علم بے کار ہے۔

انسانوں کے اندر انسانیت ختم ہونے کے ساتھ ہی منافقت نے جنم لے لیا ہے اور انسان اس قدر منافق ہو چکا ہے کہ اسے ہر وقت صرف اپنا مفاد نظر آتا ہے۔ جوآن اپنے انشائیے "مبارک ترین" میں ایسے ہی منافق انسان کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو سب سے زیادہ ملنسار ہوتا ہے وہ اسی قدر منافق ہوتا ہے کیونکہ موجودہ دور میں ملنساری منافقت کا دوسرا نام ہے۔ جیسا کہ حضرت علی کا قول ہے کہ اگر تمہارا کوئی دشمن نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ تم منافق ہو۔ اور اس دور میں منافقت ہر طرف پھیلی ہوئی ہے اور منافق انسان ظالم اور مظلوم دونوں سے تعلق رکھتا ہے اور اپنا مطلب نکالتا ہے اور یوں یہ لوگوں کے درمیان اختلافات کا باعث بنتا ہے۔

جوآن نے ایک اور انشائیے " نظر آنا "میں انسان کی منافقت کا ذکر کیا ہے لیکن یہ منافقت وہ اپنے فائدے کے لیے نہیں اپناتا بلکہ یہ منافقت انسان کے اس دوغلے پن کے حوالے سے ہے جو کہ وہ معاشرے کے ڈر سے اپناتا ہے کیونکہ اس سماج میں رہنے والے ہر فرد کو یہ خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ اس کے مسائل یا اس کے غموں پر لوگ کیا کہیں گے اِس لیے وہ اپنے دکھوں کا ماتم نہیں کرتا اور نہ ہی اپنی مجبوریاں اور تکالیف وہ دوسروں انسانوں پر عیاں کرتا ہے اِس لیے معاشرے کے اس خوف نے انسان کو اداکار بنا کر رکھ دیا ہے اور یہ انسان چاہے اندر سے کتنی ہی پریشانیوں میں مبتلا ہو لیکن یہ اپنے دکھوں اور غموں کو اپنے دل میں ہی رکھتا ہے اور دوسروں کے سامنے خوش اور خوشحال نظر آنے کی اداکاری کرتا ہے۔ اس لیے جوآن کہتے ہیں کہ اس

معاشرے میں شاید ایسے انسانوں کی گنجائش نہیں رہی جو کہ اپنی اصل حالات کے ساتھ اس معاشرے میں رہتے ہیں جنہیں لوگوں کی باتوں کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کیونکہ اب اس معاشرے میں ہر شخص اداکار بن گیا ہے جو جیسا اندر سے ہے ویسا نظر نہیں آتا اور یہ تمام قصور معاشرے کا ہے اور معاشرہ انسانوں سے وجود میں آتا ہے۔ اس طرح آدمی اپنی اصل حالت میں نظر نہیں آتا بلکہ دوغلے پن کا شکار ہو گیا ہے۔

اِسی طرح جوؔن اپنے انشائیے "ہم اُداس ہیں" میں معاشرتی جرائم اور معاشرتی برائیوں کا ذکر کرتے ہیں کہ ہمارے سماج میں چاہے حکمران طبقہ ہو یا عوام ہر ایک برائیوں میں گھِرا ہوا ہے اِسے اس بات کی کوئی فکر ہی نہیں کہ یہی جرائم اور برائیاں اس کے لیے عذاب لا سکتی ہیں۔ نہ صرف اِن کو بلکہ اِن کے ساتھ ساتھ اس پوری قوم کے لیے عذاب کا سبب بن سکتی ہے کیونکہ اگر ہم ماضی پر نظر دوڑائیں تو آج تک جو بھی قوم برائیوں اور جرائم میں مبتلا رہی ہیں وہ اپنے ان جرائم کی سزا سے نہیں بچ پائی۔ اِن پر ان کے جرائم کی وجہ سے عذاب نازل ہوا۔ چاہے وہ سزا انہیں خیانت کرنے پر ملی ہو یا اِن کی جہالت کی وجہ سے برائیوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ملی ہو۔ انہیں ان کے کیے کی سزا ہر صورت ملی لیکن یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہمین اپنی تمام تر برائیوں اور جرائم کے باوجود ابھی مہلت ملی ہوئی ہے کہ ہم اس سب سے باز آجائیں۔ بہت سے دانش ور بھی حیان ہے کہ اِن تمام خطاؤں اور جرائم کے باوجود یہ ملک کیسے ابھی تک قائم ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمیں ابھی مہلت ملی ہوئی ہے کہ ہم سنبھل جائیں۔

سماج جو کہ انسانوں سے وجود میں آتا ہے اور اِس میں رہنے والے افراد جہاں اپنی زندگیوں میں مختلف مشاغل کو اپناتے ہیں وہیں وہ تفریح و طبع کے لیے کھیلوں کا آغاز کرتے ہیں کھیلوں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ ہر زنانے میں اس کو خاص اہمیت سی گئی ہے اور نہ صرف اس پر خاص توجہ دی گئی بلکہ اس پر کثیر تعداد میں سرمایہ بھی لگایا گیا ہے اسی طرح ہر چیز میں توازن، اعتدال سے کام لینا ضروری ہے اِسی طرح اس میدان میں بھی اتنی ہی توجہ صرف کرنی چاہیے جتنی ضرورت ہے۔ جوؔن ایلیا بھی اسی موضوع کو اپنے انشائیے "دماغ کے بغیر" میں بیان کرتے ہیں۔ اِن کی نظر میں کھیل ایک ایسا کام ہے جہاں دناغ کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی۔ اِن کے خیال میں کھیلوں کی اہمیت مسلم ہے لیکن ہمارے ہاں اس معاملے میں حد سے زیادہ جذباتی ہو کر کام لیا جاتا ہے اور دیگر شعبوں کے مقابلے میں اِس کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وزارتِ تعلیم کے رکنِ اعلیٰ جناب حبیب الرحمٰن نے اولمپی کھیلوں کے موقع پر عوام سے کھلاڑیوں کے لیے خصوصی دعائیں

کرنے کی اپیل کی۔ اگر تعلیم کے شعبے سے منسلک اپنی کھیلوں کو اس قدر اہمیت دیں گے تو عوام کس جانب اور کس راستے پر چلیں گی۔

اِس سلسلے میں جوّن ایلیا کہتے ہیں کہ اگر کھیلوں کو اس قدر اہمیت دی گئی اور کھلاڑیوں کو اسی طرح قوم کا ہیرو مانا گیا تو نوجوان نسل تعلیم کے شعبوں میں کوئی خاطر خواہ توجہ نہیں دیں گے۔ حالانکہ تعلیم کے میدان میں ہی ترقی کر کے وہ اصل کامیابی حاصل کر سکیں گے لیکن ہر جانب صرج کھیلوں کے چرچے ہونے سے نوجوان نسل تعلیم سے دور اور کھیلوں کے قریب ہو رہی ہے۔ جوّن ایلیا کہتے ہیں کہ یہ ہمارا ایک المیہ ہے کہ ہم اسی شعبے میں توجہ دیتے ہیں اسی شعبے میں کامیابی حاصل کرتا ہے اور اسی جانب عوام کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔ جس شعبے میں دماغ سے کام کم لینا پڑتا ہے یا دماغ سے بلکل کام نہیں لیا جاتا۔

اِس کے ساتھ ہی جوّن ایلیا اِس انشائیے میں اِس حقیقت سے بھی پردہ اٹھاتے ہیں کہ ہمارے سماج میں دانش وروں، ادیبوں مفکروں اور نقاروں کو خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔ وہ اہمیت اور مقبولیت جو ان کا حق ہے۔ ہمارے اس سماج میں ان کے مقابلے میں کھلاڑیوں اور اداکاروں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ جو کہ انتہائی افسوس ناک بات ہے۔ ہمارے نوجوان ادب کے لکھاریوں اور اصل معنوں میں قوم کے رہنماؤں کی محبت میں وقت گزارنے کے بجائے دیگر ممالک کے اداکاروں پر توجہ دیتے ہیں اور ان کی رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور جس کو قوم میں مقبول و مشہور ہونے کی خواہش ہوتی ہے وہ کسی بھی کھیل میں اپنا نام پیدا کر لیتے ہیں۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ ہر شعبے سے منسلک لوگوں کو ان کے جائز حقوق ملنے چاہیے۔ اور مناسبِ حال شہرت و مقبولیت بھی ملنی چاہیے تا کہ قوم گمراہ نہ ہو اور وہ غلط معارِ زندگی نہ اپنالیں۔

جدید دور میں سائنس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ یہ ترقی کی منازل طے کرتی ہے۔ لیکن سائنس کی اس ترقی کو دیکھ کر یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ اِس کی ترقی کہیں ادب پر اثر انداز نہ ہو جائے۔ جوّن ایلیا اپنے انشائیے "سائنسی ارتقا اور عظیم ادب" میں اسی خدشے کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سائنس کی اس تیز رفتار ترقی کو دیکھ کر یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ جس طرح سائنس ترقی کر رہی ہے اور اس میں نئے نئے تجربات ہو رہے ہیں اور چہار سو اِس کا چرچا ہے تو یہ سب ادب پر اثر نہ ڈالے۔ یہ خدشات انیسویں صدی کے تھے کہ شاید ایسا ہو سکتا ہے لیکن یہ تمام خطرات غلط ثابت ہوئے کیونکہ سائنسی تجربات کے لیے انسان پیدا نہیں ہوا بلکہ سائنس کو پیدا کرنے والا انسان ہے۔ اور سائنس انسان کی محتاج ہے۔ سائنس انسان کی مددگار ہے۔ یہ تو انسان کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔ اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو سامنے لاتی ہے۔ اس

کا مقصد تخریب کاری ہر گز نہیں ہے۔ اس لیے سائنس سے نفرت کرنے کے بجائے اس سے محبت کرنی چاہیے، اسی سائنسی دنیا میں ادب بھی پروان چڑھتا ہے کیونکہ ادب کو پیدا کرنے والا بھی انسان ہی ہے اس لیے اس وسیع کائنات میں ادب کو سائنس سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

سائنس کی ترقی اور اہمیت کے حوالے سے جوؔن اپنے انشائیے "سائنسی ارتقاء اور عظیم ادب" میں لکھتے ہیں۔

> ادب کو سائنسی عہد سے ذرا بھی خطرہ نہیں بلکہ اب تو اس کو اپنے بازوؤں میں اور بھی توانائی پیدا کرنا ہے۔ اب تو کائنات کچھ اور بھی پر اسرار، کچھ اور بھی پیچیدہ اور کچھ اور بھی عظیم ہو گئی ہے۔ سائنس نے کائنات کو تنگ نہیں وسیع کیا ہے، وہ برابر پھیل رہی ہے، پھیلتی ہی چلی جائے گی اور ادب اس وسعت، عظمت اور متحرک لامحدودیت میں پرواز کرتا رہے گا۔ (۱۴)

اِس کے ساتھ ساتھ جوؔن اپنے اِس انشائیے میں ایک اور بات کی طرف ہماری توجہ دلاتے ہیں کہ بہت سے روشن فکر لکھنے والے ایسے ہیں جو گوشہ گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے اندر اعلیٰ ترین صلاحیتیں ہونے کے باوجود وہ ادبی دنیا میں منظرِ عام پر نہیں آتے لیکن یہ اب ان کا اپنا فرض ہے کہ وہ اپنی پہچان خود کرائیں۔ خود کو اس گمنامی کے اندھیروں سے باہر نکالیں کیونکہ وہ کسی سے کم نہیں۔ اِن کے اندر اچھے لکھاریوں کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ صرف اِن کو فکری تربیت کی ضرورت ہے اور یہ تمام باتیں اس وقت یہ ممکن ہے جب ادب کو محض تفریح کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے ایک اہم ادارہ خیال کیا جائے گا حالانکہ یہ عہد ادب کے لیے کافی ساز گار ہے۔

سائنس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، سائنس کی بدولت ہی آج انسان ترقی کی منازل طے کر رہا ہے اور اس قابل ہوا ہے کہ وہ فضاؤں میں پرواز کر رہا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے سیاروں پر بھی قدم رکھ لیا ہے اور ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے لیکن یہ انسان جو آسمان پر اس قدر ترقی کر رہا ہے زمین پر رسوا اور ذلیل ہے۔ سائنس جو کہ انسانوں کی مددگار ثابت ہوئی اور اس میں ترقی کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ سب کو آسانی فراہم کی جائے اور یہ سائنس روزمرہ زندگی میں انسانوں کے کام آئے لیکن یہ سائنس آج تخریب کا موجب بنی ہوئی ہے کیونکہ اِس کو بنانے والے، اس میں ترقی کی منازل طے کرنے ولاے انسان تھے اور اس کے ذریعے تباہی و بربادی مچانے والے بھی انسان ہی ہیں۔ انسانوں کا ایک گروہ سائنس میں ترقی کر رہا ہے لیکن اس سے

ان لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا جو اس معاشرے میں اپنے مسئلوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ مختلف بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ طاقت ور افراد کے ہاتھوں پسے ہوئے ہیں۔ ایسے غریب عوام کو سائنس کی اِن کامیابیوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

اِس کے ساتھ ہی جوؔن ایلیا مزید کہتے ہیں کہ ہر معاملے میں علم و آگہی ضروری ہے کیونکہ انسان ایک طرف تو سائنس کے کارنامے کر رہا ہے اور دن بدن ترقی کر کے دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کر رہا ہے اور دوسری طرف اِسی سائنس کی بدولت انسانوں اور نسلوں کو تباہ کرنے کا گھناؤنا کام جاری ہے۔ انسان نے اپنا تمام علم، اپنی مہارت، ہنر اور محنت سائنس کو ترقی دینے میں لگائی لیکن تاریخ گواہ ہے کہ انسانوں نے اسی سائنس کی بدولت نسلوں کو تباہ کیا۔ زمین پر تباہی مچائی۔ اِس لیے جوؔن کہتے ہیں کہ سائنس جو کہ انسانوں کہ مددگار ہے اس کو بھی صحیح استعمال میں لانے کے لیے بھی انسانوں میں شعور ہونا ضروری ہے۔ نہ صرف شعور بلکہ ان میں سب سے بڑھ کر انسانیت کا ہونا لازمی ہے تب جا کر وہ اس مفید چیز کو لوگوں کی فلاح کے لیے استعمال کر سکیں گے۔

جوؔن ایلیا نے جہاں اپنے انشائیوں میں دیگر سماجی موضوعات پر بحث کی ہیں اور معاشرے کی تمام برائیوں کو اپنے انشائیوں کے ذریعے بے نقاب کیا ہے وہیں اپنوں نے ان باتوں بھی بیان کیا ہے جس کے سبب ہم جہاں تھے وہیں کھڑے ہوئے ہیں۔ جوؔن ایلیا نے اپنے اس انشائیے " نقل "میں بتایا ہے کہ ہم آزادی حاصل کرنے کے باوجود بھی آج تک مغرب کے غلام بنے ہوئے ہیں۔ بظاہر تو ہم آزادی جیسی نعمت سے سرفراز ہو گئے ہیں لیکن ذہنی اور عملی طور پر آج بھی غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اگر کھیلوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہمارے کھیل بھی مغربی ہیں اِس لیے کھیل کے میدان میں ہمارا جیتنا اور ہارنا برابر ہی ہے۔ ہم اپنے عظیم ادبی ورثے کے موجود ہونے کے باوجود انگریزی کی تقلید میں اپنا سارا وقت برباد کرتے ہیں۔ ہماری اپنی کوئی انفرادی حیثیت نہیں ہے۔ ہمارا سراپا ہمارا اپنا نہیں رہا۔ اس میں بھی ہم اہلِ مغرب ہی کی پیروی کرتے ہیں۔ ہمارا جسم، ہماری آنکھیں، سوچ، سماعت الغرض ہم پورے کے پورے مغرب کے غلام ہو چکے ہیں۔ ہمارے وجود کی اب کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔ ہمارا وجود اب صرف جگہ گھیرنے سے زیادہ کچھ نہیں رہا۔ ہم مشرقی لحاظ سے طول و عرض کی جانب پھیل رہے ہیں لیکن ذہنی لحاظ سے ابھی بھی غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں ہم تہذیبی، ذہنی اور معاشرتی ہر اعتبار سے مغرب کے غلام ہیں۔

جوؔن ایلیا ہندوستان کے شہر امروہہ میں پیدا ہوئے تھے اور پھر امروہہ سے ہجرت کر کے کراچی منتقل ہو گئے تھے اور باقی کی زندگی انہوں نے کراچی میں ہی گزاری۔ کراچی کے ابتر حالات کی وجہ سے ان کا دل کڑھتا تھا۔ انہوں نے کراچی کے حالات کا ذکر اپنے انشائیوں میں کیا۔ جوؔن اپنے انشائیے " مرثیہ شہر کراچی " میں کراچی کے حالات کو بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہاں امن و امان کی صورتِ حال نہایت ابتر ہے۔ یہ وہ شہر تھا جسے روشنیوں کا شہر کہا جاتا تھا۔ ہر طرف امن و امان تھا لیکن پھر ہوا بدلی کہ چہار سو نقشہ ہی بدل گیا۔ اِس شہر کے چوراہے، گلی کوچے، بازار فرض کہیں بھی امن اور خوشحالی قائم نہین رہی۔ ہر طرف اداسی ہی اداسی ہے۔ اس کی تمام رونقیں ختم کو کر رہ گئی ہے۔ انسانوں کی بھیڑ موجود ہے لیکن اگلے لمحے کا کوئی بھروسہ نہیں کہ ان کے ساتھ کیا سلوک ہو۔

ایک وقت تھا جب کراچی میں امن و دسکون تھا لیکن اب قتل و غارت گری عام ہے۔ لوگ مختلف قبائل میں بٹ گئے ہیں یہاں مختلف زبانیں بولنے والے موجود ہیں جن میں اردو، پنجابی، سندھی اور پشتو بولنے والے شامل ہیں۔ انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ۹ مختلف سیاروں سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں یہاں زبردستی اکٹھا رہنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ اور اب یہ ایک دوسرے سے اس قدر عاجز آ گئے ہیں کہ ایک دوسرے کے دشمن بن گئے ہیں ان حالات میں لوگ اس قدر خوف زدہ ہو گئے ہیں کہ انہیں اس بات کا یقین ہی نہیں رہا کہ جو گھر سے باہر کسی کام سے لیا گیا ہے وہ گھر واپس لوٹ کر آئے گا بھی یا نہیں۔ پیشہ ور مجرم ان حالات میں اپنا کاروبار چلا رہے ہیں لیکن ہمارے سیاستدان عوام کے لیے ان کے تحفظ کے لیے کچھ نہیں کر رہے وہ صرف اپنی سیاست چمکا رہے ہیں۔

جوؔن کراچی کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> وہ شہر جو روشنیوں کا شہر تھا، اب ویران سا ہو گیا ہے اس کی بستیاں آپس میں ایک دوسرے کو ہلاکت کے دھماکوں اور دہاکوں کی سوغاتیں بھیجتی رہی ہیں۔ بستیوں کی رونقیں تباہ کی جاتی رہی ہیں اور تباہ کرنے والے کسی غنیم آ کے آدمی نہیں ہیں بلکہ ان بستیوں یہ کے نوخیز فرزند ہیں۔ اپنے اپنے گروہوں کے دل بند اور اپنے اپنے قبیلوں کے ارجمند ہیں۔ (۱۵)

جوؔن ایلیا ان تمام حالات کی وجہ سے کرب اور تکلیف سے دوچار ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی کے بہت سے سال اس شہر میں بسر کیے ہیں۔ زندگی کے کئی دکھ اور خوشیاں، اچھے اور بُرے دن یہاں گزارے

ہیں۔اس لیے انہیں اس شہر کے ابتر حالات کا انتہائی دکھ ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ان حالات کا مرثیہ لکھنے والا میرے علاوہ اور کوئی شخص بھی نہیں ہے۔جوؔن نے کراچی کے یہی حالات اپنے انشائیوں "ایک طور "اور "سلامتی "میں بھی بیان کئے ہیں۔

حکیم محمد سعید جو کراچی کے رہنے والے تھے اور دلی سے ہجرت کر کے کراچی آئے اور پھر یہی مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی تھی۔اس انشائیے " قاتل کون تھا؟ "میں جوؔن ایلیا حکیم محمد سعید کے قتل کے حوالے سے بات کر رہے ہیں کہ ان کی موت پر گہرے غم اور دکھ کا اظہار کر رہے ہیں۔جوؔن کہتے ہیں کہ اس سماج میں جہاں تمام برائیاں اپنے عروج پر ہیں انصاف نام کو نہیں،اخلاقی قدریں پامال کی جاتی ہے،شرافت دیکھنے کو نہیں ملتی تو ایسی صورتِ حال میں جب کوئی سچائی کی بات کرے اور دانش و عقل کی بات انتہائی بے باکی کے ساتھ کریں تو اس کے ساتھ تو یہی کچھ ہوتا ہے جو کہ حکیم محمد سعید کے ساتھ ہوا۔انہیں ان کی سچائی کی سزا ان کی موت کی صورت میں ملی۔اس لیے یہ خود ایک لحاظ سے اپنے قتل کے ذمہ دار ہیں جنہوں نے اس معاشرے میں سچائی بولنا چاہی۔

جوؔن اپنے انشائیے " بے ضمیر "میں ان بے بس اور مظلوم لوگوں کا ذکر کرتے ہیں جو مشرقی پاکستان کے الگ ہو جانے کی صورت میں بنگلہ دیش میں ہی رہ گئے تھے اور ان مظلوم انسانوں کو دکھ کو بیان کرتے ہیں کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے برصغیر کی تقسیم کے وقت پاکستان کا انتخاب کیا تھا اور ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے لیکن پھر سقوطِ ڈھاکہ کے نتیجے میں یہ بنگلہ دیش میں ہی رہ گئے۔اب ان لوگوں کے لیے نہ پاکستان میں جگہ ہے اور نہ ہی بنگلہ دیش میں ہے۔یہ افراد جو کہ پاکستانی ہے ان پر وہاں ظلم و جبر کیا جارہا ہے اور وہ وہاں ظلم و جبر کی زندگی گزار رہے ہیں۔بنگلہ دیش کی حکومت انہیں پاکستان بھیجنا چاہتی ہے جبکہ پاکستانی حکومت ان لوگوں کو کسی طور قبول کرنے کو تیار نہیں یہاں تک کے بنگلہ دیش کے وزیرِ اعظم شیخ مجیب الرحمٰن نے صاف الفاظ میں پاکستانی حکومت کو کہا ہے کہ وہ ان 3 لاکھ پاکستانیوں کو اپنے ملک میں واپس کے آئیں جو بنگلہ دیش میں رہائش اختیار کیے ہوئے ہیں اور ان کے بدلے میں بنگال افراد جو کہ پاکستان میں موجود ہیں انہیں بنگلہ دیش بھیجا جائے لیکن ہماری بے حس حکومت اور عوام انہیں کسی طرح بھی یہاں قبول نہیں کر رہی اور نہ ہی ان مظلوم افراد کی بنگلہ دیش میں جگہ ہے۔ایسی صورتِ حال میں نہ ہی حکمران ان کے لیے کچھ کر رہے ہیں اور نہ ہی عوام ان کے حق میں کچھ بول رہی ہے۔اور نہ ہی کوئی لکھاری ان کی اس بے بسی اور مظلومیت پر آواز بلند کر رہے ہیں۔

اِس کے ساتھ جوؔن اس انشئیے میں ادیبوں پر بھی طنز کرتے ہیں کہ یہ ادیب اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ انہیں ان مظلوم افراد کا دکھ نظر نہیں آتا۔اِن کی بے بسی کو یہ نظر انداز کر رہے ہیں۔لکھنے والے ان کے دکھ اور تکالیف پر قلم نہیں اٹھا رہے کیونکہ انہیں ڈر ہے کہ انکے لکھنے سے کوئی گروہ انکے مخالف نہ ہو جائے۔اس لیے وہ خود کو انسانوں کو دوست اور ان کا غم گسار تو کہتے ہیں لیکن اِن کے لیے ان کے حق کے لیے آواز بلند نہیں کرتے۔

بر صغیر پاک و ہند میں ہندو اور مسلمان دونوں قومیں بستی تھیں اور تقسیم کے بعد یہ دونوں اقوام اپنی آزاد ریاست بنانے میں کامیاب لوگئی لیکن اِن دونوں قوموں نے آزادی حاصل کرنے کے بعد کوئی خاطر خواہ ترقی نہیں کی۔جوؔن ایلیا اپنے انشائیے "بے حاصلی" میں اس موضوع کو زیرِ بحث لاتے ہیں کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد اس نے کوئی ترقی نہیں کی حالانکہ جو ملک اُس کے بعد آزاد ہوئے تھے وہ اس حد تک ترقی کر چکے ہیں کہ مغرب والے ان پر رشک کرتے ہیں حالنکہ کچھ عرصہ پہلے تک یہ ممالک گوشہء گمنامی میں تھے لیکن انہوں نے اپنی محنت اور کوشش کے بل بوتے پر اتنی ترقی حاصل کرلی کہ اپنے سے پہلے آزاد ہونے والے ممالک کو پیچھے چھوڑ دیا۔اور اب ان ممالک پر مغرب والے بھی رشک کرے ہیں لیکن پاکستان نے آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی ترقی نہیں کی۔یہاں کے حکمران صرف اپنے مفادات کے حصول کے لیے کام کرتے ہیں کہ ہم نے آزادی تو حاصل کرلی لیکن ترقی نہیں کی۔

جوؔن اپنے ایک اور انشائیے "حساب فہمی" میں حکمرانوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حکمرانوں نے عوام کی خواہشات کو پسِ پشت ڈال کر صرف خود پر توجہ دی۔یہ عوام کی ترقی کا سوچنے کے بجائے صرف ایک دوسرے پر الزام تراشی کرتے رہے۔اور ان تمام باتوں کی وجہ سے ہم دوسرے ممالک کے سامنے بھی شرمندہ ہوئے لیکن جوؔن اِن تمام باتوں کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ حکمران تو درحقیقت عوام کے عکاس ہوتے ہیں جیسی رعایا ہوتی ہے اس کے حکمران بھی ویسے ہی ہوتے ہیں۔یا وہ ویسے ہی حکمران منتخب کرتی ہے۔اس لیے عوام کو خود اپنی اچھائیوں اور برائیوں کا حساب کر کے اپنے آپ کو ٹھیک کرنا چاہیے۔ہم دوسروں کو تو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں لیکن اپنے اعمال پر غور نہیں کرتے۔

پاکستان کا بننا ایک کیثر پہلو واقعہ ہے۔معاشرے کے مختلف افراد نے اسے مختلف پہلوؤں سے لیا۔خاص کر دائیں بازو اور مذہبی خیالات رکھنے والے ادیبوں کے علاوہ تمام اربابِ ادب نے اس واقع کو منفی ہی لیا ہے۔ان کے نزدیک تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کا کوئی فائدہ نہیں ہوا،نہ ہی ہندوستان اس سے کوئی فائدہ

اٹھا سکا نہ ہی پاکستان کے حصے میں کوئی خاص فائدہ آیا۔ یہاں دونوں طرف تباہی اور خون ریزی کے طوفان ضرور آئے۔ سو حساس طبع کے ادیبوں نے اس پہلو پر بہت کچھ لکھا جن میں بائیں بازو کے تقریباً سبھی ادیب منٹو اور جونؔ وغیرہ شامل ہیں۔ جونؔ کا انشائیہ "ہر بات کا جواب" اسی بات کی دلیل ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ دونوں ممالک اس نام نہاد آزادی کی خوشی کی بجائے ماتم کرنا چاہیے۔

پاکستانی معاشرہ من حیث القوم جمود اور تعطل کا شکار ہے۔ ہمیں محنت کرنے میں عار محسوس ہتی ہے۔ ہر فرد تھوڑا کام کر کے زیادہ فوائد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ ہمارا مشترکہ المیہ ہے۔ ہر طرح کی گھٹن نے اس المیے کو دوچند کر دیا۔ اس پر ہماری بے حسی اور بے شعوری نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ ہم دن بدن تنزل کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور ترقی یافتہ اقوام کے برابر آنے کی ہماری کوئی امید نظر نہیں آ رہی۔ اسی حوالے سے جونؔ اپنے انشائیے "اکیسویں صدی" میں لکھتے ہیں۔

> اکیسویں صدی پاکستان میں آئی نہیں ہے بلکہ اغوا کر کہ لائی گئی ہے۔ ہم تو ابھی تک اپنی قرونِ مظلمہ سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھے۔[۱۶]

ہم لوگ ترقی کے دشمن ہیں ہمیں منزل پر پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں ہے ہم اپنی ازلی سستی کی وجہ سے وہیں رُکے ہوئے ہیں جہاں پہلے تھے۔ دن بدلے، مہینے بدلے، سال بدلے، دہایاں بدلیں اور صدیاں بدلیں مگر ہماری حالت ذرا بھی نہ بدلی۔ جیسی کل تھی ویسی آج بھی ہے۔ اس میں زرا سا بھی فرق نہ آیا۔ ہم کل بھی تنزل کا شکار تھے اور آج بھی ترقی کی طرف جانے کے نہ تو خواہاں ہیں اور نہ ہی کوشاں۔ ہماری حالت ایک ایسے راہ گیر کی طرح ہے جو کہیں جانا تو چاہتا ہے لیکن اس کے لیے چلنا نہیں چاہتا۔

جونؔ ایک مثالیت پسند آدمی تھے۔ سو یہ سمجھتے تھے کہ انسانوں پر نئی صدی آنے کے ساتھ ان میں انسانیت بھی آنی چاہیے لیکن جونؔ کہتے ہیں کہ اکیسویں صدی میں ہمارے لیے صرف ایک صدی بدل رہی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ ہم میں انسانیت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ ہم ایک دوسروں کے گلے کاٹ رہے ہیں ہم ایک دوسرے کو مارنے کے لیے اسی طرح ہتھیار بنائے جا رہے ہیں اور وسیع پیمانے پر تباہی و بربادی پھیلانے والے ہتھیار بنا رہے ہیں۔ بلاشبہ ہر صدی گزشتہ صدی سے ہر اعتبار سے بڑھ کر ہوتی ہے او عر بیسویں صدی جہاں ایک طرف گزشتہ تمام صدیوں سے زیادہ ترقی یافتہ ثابت ہوئی وہیں یہ صدی ایک بدترین صدی بھی ثابت ہوئی۔ اس صدی میں بہت سی جنگیں لڑی گئیں۔ انسانوں کو خون بہایا گیا۔ جدید اتھیار بنائے گئے جو کہ تباہی و بربادی کا سبب بنے لیکن جونؔ کہتے ہیں کہ اس صدی تک آتے آتے انسانوں میں انسانیت ختم ہو کر رہ گئی

ہے۔پہلے انسان جہالت میں ڈوبا ہوا تھا لیکن اب عقل و بصیرت رکھتے ہوئے بھی دوسروں کا دشمن بنا ہوا ہے۔جوآن یہ امید کر رہے ہیں کہ اس نئی صدی میں انسان انسانیت کو بچالیں گے۔

جوآن حکمرانوں پر تنقید کرنے کو ساتھ ملک کی اس ترقی کے حوالے سے بھی بات کرے ہیں جس کی بناء پر وہ آج دنیا کے ایٹمی ممالک کی فہرست میں شامل ہے۔جوآن اپنے انشائیے" دنگل "میں ان 6 ایٹمی دھماکوں کا ذکر کرتے ہیں جو کہ پاکستان نے ۱۹۹۸ء میں بھارت کے ۱۵ ایٹمی دھماکوں کے جواب میں کیے تھے۔جوآن کہتے ہیں کہ پاکستان کے لیے یہ ایٹمی دھماکے کرنا بہت ضروری تھا تا کہ وہ اس بات کو ثابت کر سکیں کہ یہ قوم اگر صحیح معنوں میں اُٹھ کھڑی ہو تو یہ کسی سے کم نہیں کیونکہ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے الگ ہو جانے کی صورت میں پاکستان کے ماہر فوجی مبصرین نے جو خود نوشتیں لکھی تھیں اس میں اس حقیقت کا اعتراف کیا گیا تھا کہ ہندوستان پاکستان سے زیادہ طاقت ور ہے لیکن پاکستان نے اس جوابی کاروائی سے یہ ثابت کر دیا کہ یہ قوم کسی سے پیچھے اور کم زور نہیں ہے لیکن جوآن یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ دھماکے اچھا عمل نہیں بلکہ ان دھماکوں کی وجہ سے بنیادی طور پر دونوں ممالک ہلاکت اور تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔

جوآن ایلیا حالاتِ حاضرہ کے متعلق بات کرتے ہیں کہ لوگوں میں سوچنے اور دیکھنے کی صلاحیت تو مودود ہے لیکن وہ اس صلاحیت کو کام میں نہیں لاتے۔پہلے لوگ دیکھتے تھے،سوچتے تھے اور پُر امید تھے کہ حالات ضرور بدلیں گے۔ایک مثالی معاشرے کا خواب دیکھتے تھے لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا حالات بدلے اور اب ایسا دور آچکا ہے کہ لوگوں نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔وہ اپنے حالات سے مایوس ہو چکے ہیں اور انہیں اپنے مستقبل میں اچھے دنوں کی کوئی امید باقی نہیں رہی لیکن جوآن اس کے ساتھ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ہم اپنے ان حالات کو اپنی محنت، کوشش اور جدوجہد سے بدل سکتے ہیں اور اس دنیا کو اپنے لیے جنت بنا سکتے ہیں۔اگرچہ ہم اس دنیا کو مکمل طور پر تو تبدیل نہیں کر سکتے اور مثالی معاشرہ نہیں بنا سکتے لیکن کچھ نہ کچھ حالات کو بہتر کر سکتے ہیں کیونکہ محنت کا ثمر ضرور ملتا ہے اور جب ہم اپنی محنت کی بدولت اس جہان کو تبدیل کریں گے تو یہی ہمارے لیے جنتِ ارضی ہو گی۔

دنیا میں رہنے اور زندگی گزارنے کے لیے کچھ اصول و قوانین بنائے جاتے ہیں اور پھر انہیں اصول و قوانین کو معاشرے کے طاقت ور افراد توڑ دیتے ہیں۔اس انشائیے میں انہی طاقت ور افراد کو تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور ان پر غصے کا اظہار کیا جا رہا ہے۔کیونکہ زندگی سب کے لیے ایک جیسی ہے اور اس کو گزارنے کے لیے افراد کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں لیکن معاشرے کے طاقت ور افراد نے ان اصولوں سے روگردانی

کی اور ان اصولوں کو توڑا اس کے لیے انہوں نے جھوٹ اور دھوکے کا سہارا لیا ہے۔ اور دوسرے افراد سے آگے نکلنے کی دوڑ میں اور سب پا لینے کی خواہش میں انہوں نے باطل راستوں کا انتخاب کیا۔ سچ سے ناطہ توڑ دیا جس کی وجہ سے معاشرے میں ایک بگاڑ پیدا ہو گیا اور یہ بگاڑ بڑھتے بڑھتے اتنا بڑھا کہ اب وہی شخص کامیاب نظر آتا ہے۔ جو ان حدود سے تجاوز کرتا ہے اور جو ان حدود کا احترام کرتا ہے۔ سچ کے راستے پر چلتا ہے۔ اسے بُری طرح روندا جاتا ہے۔ اس لیے جوؔن کہتے ہیں کہ صحیح اور باطل راستے کے درمیان جو امتیاز موجود ہے اسے ہم سب نے مل کر قائم کیا ہے اور یہ اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتا جب تک ہم باطل راستوں کو مٹا نہیں دیتے تب ہی معاشرہ اور اس کے افراد ترقی کر سکیں گے اور معاشرے کے قائم کردہ اصول و قوانین کی پابندی کریں گے۔

تنزل پذیر معاشرے میں جدت کی مخالفت کی گئی چاہے وہ جدت افکار اور نظریات کی ہو چاہے مادی اور وہ شخص جو جدت کی بات کرتا ہے۔ سماج نے ہمیشہ اسے تکلیفیں دیں اور اس کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کی اور بہت کم ہی لوگ اس کے ساتھ کھڑے ہوئے۔ پاکستانی معاشرے کا بھی یہی حال ہے۔ اِسی حوالے سے جوؔن نے اپنے انشائیے "سقراط سے سرمد تک" میں سقراط اور سرمد کی مثالیں دے کر ہمارے اسی المیے کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارا معاشرہ بھی ہمیشہ سے اہلِ علم اور پرانے خیالات اور فرسودہ روایات سے بغاوت کرنے والے افراد کا بلکل اسی طرح سے دشمن ہے جس طرح قدیم معاشرہ تھا اور ایسے لوگوں کو آج بھی وہی سزائیں اور تکلیفیں دی جاتی ہیں جو اس دور میں دی جاتی تھی۔ اس میں موضوعِ بحث پاکستانی معاشرہ یہ نہیں بلکہ پورا عالمِ اسلام ہے اور مختلف تاریخی حوالوں کے ساتھ انہوں نے اپنی اِس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

سماج میں تغیر بہت ضروری ہے کیونکہ جوں جوں وقت گزرتا ہے کوئی قوم ترقی کی جانب گامزن ہوتی ہے تو اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ وقت کے ساتھ چلے۔ جو وقت کا تقاضا ہے اِسے پورا کرے کیونکہ اگر کوئی معاشرہ وقت اور حالات سے ہم آہنگ نہیں ہو گا تو وہ جمود کا شکار ہو گا اس طرح وہ معاشرہ اور اس کے افراد ترقی نہیں کر سکیں گے۔ مثال کے طور پر پہلے انسان جانوروں جیسی زندگی بسر کرتا تھا لیکن پھر اس نے شعور سے کام لے کر ترقی کرنا شروع کی۔ گھر بنائے ضروریاتِ زندگی کے سامان بنائے اور اسی طرح کاغذ ایجاد کیا۔ اگر انسان اپنی سوچ کو نہ بدلتا تو وہ آج بھی ویسی ہی زندگی بسر کر رہا ہوتا جیسی صدیوں پہلے بسر کرتا تھا اس لیے ترقی کرنے کے لیے سوچ کو تبدیل کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ اگر سوچ کو بدلا نہیں جائے تو معاشرہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے اس لیے جمود کے بجائے حرکت و عمل کو اپنانا چاہیے۔

حوالہ جات

۱۔ اعجاز فاروقی، "پاکستان کا فکری بحران"، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۱

۲۔ علی عباس جلال پوری، "عام فکری مغالطے"، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۸۹

۳۔ جونؔ ایلیاء، "فرنود"، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۲۳۱

۴۔ برٹرنڈ رسل، "نظامِ معاشرہ اور تعلیم"، مترجم جی۔ آر عزیز، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع سوم، فروری ۱۹۸۸ء۔

۵۔ جونؔ ایلیاء، "فرنود"، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۲۲۵

۶۔ ایضاً، ص ۲۲۹

۷۔ ایضاً، ص ۴۲۰

۸۔ ایضاً، ص ۴۶۰

۹۔ ایضاً، ص ۴۳۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۵۷۴

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۵۰

۱۲۔ طارق مغل محمود، "معاشرتی نفسیات"، اُردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۲۲

۱۳۔ جونؔ ایلیاء، "فرنود"، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۴۹۰

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۱۴

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۵۶

۱۶۔ ایضاً، ص ۶۷۰

باب سوم :

"سیاسی موضوعات"

یونان کے مشہور فلسفیوں یعنی افلاطون اور ارسطو نے انسان اور معاشرے کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے اپنے خیالات کی اساس اس تصور کو بنایا ہے کہ انسان ایک عمرانی اور سیاسی حیوان ہے۔ اس کے بعد یہ استدلال پیش کیا ہے کہ انسان چونکہ عمرانی حیوان ہے اس لیے اس کی فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ معاشرے میں زندگی بسر کرے۔ فرد کا اپنے ہم جنسوں سے الگ الگ رہ کر زندگی بسر کرنا فطرت کے قطعاً خلاف ہے۔ اس لیے کہ فرد کی فطرت صرف معاشرے ہی میں، صحیح نشوونما حاصل کر سکتی ہے اور انسان صرف اس طریق پر اپنی ذات کی تکمیل کر سکتا ہے کہ معاشرے میں رہے، اپنے ہم جنسوں سے ارتباط قائم کرے، اپنے معاشرے کے فرائض کو صحیح طور پر محسوس کرے اور اپنی عمرانی ذمہ داریوں کو با احسن طریقے سے ادا کرے۔ اس لیے ان ظاہری فوائد کے علاوہ جو ریاست ایک فرد کو ظلم و تشدد کے خلاف تحفظ اور ناانصافی کے خلاف عدل کی شکل بخشتی ہے، اس پر ریاست کی شکر گزاری کا فرض اس بنا پر بھی عائد ہوتا ہے کہ وہی اُس کو اس کی انفرادیت کی لطافتوں اور مضمر قوتوں سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع عطا کرتی ہے۔

سی۔ ای۔ ایم جوڈ لکھتے ہیں:

> معاشرہ ایک مصنوعی ساخت یا عمارت سمجھ لیا گیا ہے جو انسان کی طبعی اور ابتدائی حالت کی بنیاد پر زبردستی تعمیر کر لی گئی ہے اور یہ اس مخصوص اور قطعی معاہدے کا نتیجہ ہے جو طبعی حالت کی ناقابلِ برداشت غیر محفوظی کو ختم کرنے کی غرض سے افراد نے آپس میں کر لیا تھا۔ معاشرے کے آغاز کے متعلق یہ "نظریہ، معاہدہ، عمرانی" کے نام سے موسوم ہے۔ (۱)

کسی بھی معاشرے کا رویہ ان کی ترجیحات سے طے ہوتا ہے۔ امریکی اور یورپی معاشرے میں تعلیم، سائنس اور فن کو اہمیت دی جاتی ہے لیکن ہمارے معاشرے کے سیاستدانوں کا المیہ ہے کہ ان کی ترجیحات ہمیشہ وہی باتیں رہی ہیں۔ جن کے ذریعے عوام میں جہالت پھیلائی جا سکے تاکہ عوام باشعور ہو کر اُن سے ان کی غلطیوں کے بارے میں سوال نہ کریں۔ اسی لیے ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ عوام تعلیم سے جس قدر دور رہ سکیں بہتر رہتا ہے۔ سو پاکستان کے سیاستدان علم و ہنر کے شعبے میں کسی قسم کی سعی نہیں کر رہے۔ یہی موضوع

جون کے انشائیے "بار بار" میں بیان کیا گیا ہے اور یہی موضوع جون کے انشائیے "ایک خط" میں بھی چھیڑا گیا ہے۔ جو کہ جون کے ہندوستان کے دور کے دوران لکھا گیا ہے۔ اس انشائیے میں جون پاکستان اور ہندوستان کے حالات کے تناظر میں یہی بات کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے سیاستدانوں کی ترجیحات میں تعلیم اور شعور نہیں بلکہ صرف اپنے مقاصد کی تکمیل ہے اور اسی لیے انہوں نے مختلف قسم کے مسائل کھڑے کر کے عوام کو جاہل اور بے شعور رکھا ہوا ہے تاکہ ان کی سیاست چلتی رہے اور معاشرے میں غلطی سے بھی سوچ اور شعور جنم نہ لے سکے۔ جس سے ان کا کاروبار حکومت آسانی سے چلتا رہے۔ اسی وجہ سے وہ لوگ جو سوچتے ہیں، احساس رکھتے ہیں اور صاحب شعور میں ان کا ایک اچھے پُر امن اور محبت سے بھرے معاشرے کا خیال، محض خیال ہی بن کر رہ جاتا ہے۔

سیاست کی دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں صرف الزام تراشی ہوتی ہے۔ چونکہ سیاست میں مختلف سیاسی جماعتیں شریک ہوتی ہیں اس لیے اگر ایک جماعت کو اقتدار حاصل ہوتا ہے تو باقی جماعتیں اپوزیشن کے فرائض سرانجام دیتی ہیں۔ جونؔ ایلیا اپنے متعدد انشائیوں میں اپنے سیاستدانوں اور حکمرانوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ سیاست کی دنیا میں یہ سیاسی جماعتیں صرف ایک دوسرے پر الزام تراشی کرتی رہتی ہے حالانکہ ان کا کام قوم کو جمع کر کے ان کے فلاح و بہبود کے لیے کچھ کرنے کا تھا۔ اس ملک کو ترقی دے کر دیگر ترقی یافتہ ممالک کی صف میں لا کھڑا کرنا تھا۔ لیکن یہ جماعتیں جو کہ عوام کے تمام مسائل کو حل کرنے کا دعویٰ کرتی ہیں اور انہیں اِن عام مسئلوں اور دکھوں سے نکال کر ترقی دینے کی دعوے دار ہیں۔ حقیقت میں کچھ نہیں کرتی۔ یہ صرف باتیں کرنا جانتی ہیں اور یہ صرف اپنے بارے میں ہی سوچتی ہیں۔ اور اگر اس ملک میں سے کوئی فرد ایسا سامنے آئے جو کہ اس قوم کے عوام کی بھلائی کی بات کریں اور اِن کے حقوق کی بات کریں تو اس پر الزامات کی بوچھار کر دی جاتی ہے۔

جونؔ کے مطابق پاکستان کو صرف ابتدا کے چند سالوں میں ہی مخلص لیڈر میسر آئے۔ ایسے لیڈر جو حقیقی معنوں میں اس قوم کی بھلائی کے لئے سوچتے تھے۔ جیسے کہ سر سید احمد خان، قائد اعظم اور علامہ اقبال جیسی ہستیوں نے دن رات اس قوم کے بارے میں سوچا اور عملی طور پر اس کے لیے اقدامات کیے لیکن اس کے بعد اتنے برس گزر جانے کے باوجود اس قوم کو مخلص لیڈر نہ مل سکے۔ یہ تمام حکمران صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں۔ یہ وہ افراد ہیں جو کہ ملک کے حکمران بنے بیٹھے ہیں لیکن در حقیقت یہ حکمرانی کے اہل نہیں ہیں کیونکہ انہیں حکومت کرنا تو دور کی بات صحیح طریقے سے زندگی گزارنا بھی نہیں آتی۔

ان تمام باتوں کے ضمن میں جونؔ کہتے ہیں کہ اگر گزشتہ ادوار پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سیاستدانوں نے اِس قوم کو ترقی کی جانب لے کر جانے کے بجائے زوال اور پستی کی طرف دھکیلا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں ملک کے تمام محروموں اور مظلوموں کو اِن حکمرانوں کے خلاف بغاوت کرنی چاہیے اور اپنے حق کے لئے آواز بلند کرنی چاہیے۔ لیکن یہ حکمران عوام کو اپنے حقوق کے لیے آواز بلند نہیں کرنے دیتے اور جو اپنے حق کے لیے آواز بلند کرتا ہے اس پر جبر کیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ سیاستدان اور حکمران عوام کے لیے کچھ کرنے کے بجائے ان کے درمیان نفرتیں پھیلاتے ہیں تاکہ یہ لوگ آپس کے مسئلوں میں الجھیں رہیں اور اپنے حق کو نہ پہچان سکیں اور اگر یہ اپنے حق کو پہچان بھی لیں تب بھی وہ باقی مسائل میں اس قدر گھرے ہیں کہ سیاستدانوں کے خلاف آواز بلند کرنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اس لیے یہ طبقہ کسی طرح بھی عوام کی بھلائی اور ترقی کے بارے میں سوچ نہیں سکتا۔

اِسی طرح جونؔ اپنے انشائیے "سلامتی" میں بھی سیاستدانوں اور حکمرانوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اس طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد ہیں جو خود غرض ہے جو صرف اپنے مفادات کے حصوں کے لیے تگ و دو کرتے ہیں حالانکہ یہ عوام سے ان کی فلاح و بہبود کے وعدے اور وعدے کرتے ہیں لیکن اِن وعدوں پر عمل کرنے کا جب وقت آتا ہے تو یہ امن و امان کی صورتِ حال اس حد تک ابتر کر دیتے ہیں کہ عوام اِسی میں الجھے رہتے ہیں اور یہ سیاستدان اپنے مفاد کے لیے سرگرم رہتے ہیں۔ یہ حکمران امن و امان کا فقدان عوام کے درمیان نفرت پیدا کر کے کرتے ہیں۔ یہاں سب ایک دوسرے سے نفرت کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی علاقائی حوالے سے ایک دوسرے کا خون بہایا جاتا ہے تو کبھی لسانی امتیازات اِن فسادات کا سبب بنتے ہیں۔ اور یہ تمام نفرتیں سیاستدانوں کی پیدا کردہ ہوتی ہے اور پھر حالات اس حد تک خراب ہو جاتے ہیں کہ کسی کو اپنے زندہ ہونے کی کوئی اُمید نہیں ہوتی کہ کب وہ بھی اِن حالات کی نذر ہو جائے اِس لیے حکمرانوں اور سیاستدانوں کو چاہیے کہ وہ ملکی مفادات کے لیے سوچیں تاکہ ملک ترقی کرے۔

جونؔ جہاں حکمرانوں اور سیاستدانوں پر ملک کی ترقی نہ ہونے کے سبب تنقید کرتے ہیں وہیں وہ قانون کی بے حرمتی کرنے کے حوالے سے بھی بات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ طبقہ جس کے ہاتھوں میں ملک کی باگ دوڑ ہے جو کہ اقتدار کے مسند پر بیٹھا ہوا ہے جسے ہم حکمران اور سیاستدان کے نام سے یاد کرتے ہیں اور یہی حکمران اور سیاستدان اس ملک کا قانون بنانے والے ہیں۔ یہ لوگ قانون تو بناتے ہیں لیکن یہ خود اس کی پاسداری نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد ان قوانین پر عمل کریں۔ اس

طرح قانون کے رکھوالے خود ہی قانون توڑتے ہیں تو پھر باقی افراد بھی اِسی ڈگر پر چلتے ہیں اور ان قوانین کا احترام نہیں کرتے۔ جس سے معاشرے کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ بات حکمرانوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جن باتوں اور قانون پر وہ خود عمل پیرا نہیں ہونگے تو پھر وہ عوام سے کیسے اُمید کر سکتے ہیں کہ وہ اِن باتوں اور قوانین پر عمل پیرا ہوں گے اس لیے جب تک برابری کا اصول نہیں ہو گا اور ہر ایک طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے یکساں قانون نہیں ہو گا تب تک حالات بہتر نہیں ہوں گے اور نہ ہی اس قانون کو کوئی ماننے والا ہو گا۔

جونؔ اپنے انشائیے "حساب فہمی" میں حکمرانوں کے ساتھ ساتھ عوام کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کیونکہ یہ عوام ہی ہیں جو حکمرانوں کے خلاف نعرے لگاتے ہیں ان پر الزامات کی بارش کرتے ہیں اور حکمران طبقہ جو کہ عقل و دانائی سے محروم ہے جس نے قوم کی اُمیدوں کو ہر عہد میں روندا ہے جو کہ ہمیشہ عوام کی لعن طعن کا نشانہ رہے۔ لیکن اگر اس سب کو حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو حکمران عوام کے عکاس ہوتے ہیں یعنی کہ جیسی رعایا ہوتی ہے ویسے ہی اس کے حکمران ہوتے ہیں یا وہ ویسے ہی حکمران منتخب کرتی ہے۔ اس لیے جونؔ کہتے ہیں کہ حکمرانوں کی برائیاں گننے اور انہیں بُرا بھلا کہنے سے پہلے عوام کو چاہیے کہ وہ اپنی اچھائیوں اور برائیوں کا حساب لگائے اور خود کو ٹھیک کریں۔ جب عوام اپنی برائیوں کو دور کریں گے تب وہ ایسے حکمران منتخب کریں گے جو حقیقی معنوں میں قوم کی ترقی میں اپنا حصہ ڈال سکیں گے۔

جونؔ ایلیاء اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> تاریخ محکوموں کے اعمال کے مطابق ہی ان کے حاکم منتخب کرتی ہے، سو محض اپنے سَر دھروں کو بُرا مت کہو، اپنے کیے ہوئے کو اپنے ایمان کی میزان پر تولو۔ تاریخ، قوموں اور گروہوں کو نہ ان کے حق سے کم کرتی ہے اور نہ زیادہ، اس لیے ہم جنہیں دوسروں سے حساب فہمی کا عارضہ ہے، ہم کبھی اپنا حساب بھی دیں اپنے نامہء اعمال ہر ایک نظر توڈالیں۔ (۲)

یونان کے مشہور فلسفی افلاطون حکم رانی کو سب سے اہم مرتبہ قرار دیتے تھے اور ان کے خیال میں قوم کے حکمرانوں کو حکیموں اور دانش وروں کے گروہ سے آنا چاہیے کیونکہ جب اِس طبقے سے حکمران آئے گا تو وہ اس قوم کے مفاد کے لئے سوچے گا۔ ملک کے مسائل اور عوام کے مسائل کو سمجھ کر انہیں حل کرنے کا عزم لے کر آگے بڑھے گا۔ لیکن بد قسمتی سے ہم پر جو بھی حکمران نافذ ہوتے ہیں وہ اس قوم کو رفتہ رفتہ تباہی

کے دہانے پر لے آئے ہیں۔ اِس لئے جونؔ کہتے ہیں کہ اتنے برسوں سے سیاستدانوں اور حکمرانوں سے عوام امید لگائے بیٹھے رہے لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اِس لیے آپ اپنے ماضی کے فیصلوں اور حکمرانوں کے رویوں سے سبق سیکھنا چاہیے اور آئندہ اِن سے کوئی اُمید نہ لگا کر خود اپنی قسمت کا فیصلہ کرنا چاہیے تب جا کر ہم اپنی تقدیر کو بدل سکتے ہیں۔

اِن تمام باتوں کے ساتھ کون آخر میں یہ بھی کہتے ہیں کہ تمام سیاستدانوں کو عوام سے کیے گئے تمام وعدے پورے کرنے چاہیے۔ کیونکہ تمام انسان جو کہ اس دنیا میں آئے ہیں انہیں ایک دن اس دنیا سے چلے جانا ہے۔ کوئی بھی یہاں ہمیشہ نہیں رہا اور جب موت آتی ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتی کہ کون امیر ہے اور کون غریب، کون حکمران ہے یا کون مظلوم۔ موت سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ مرتے وقت کسی کو بستر نصیب ہوتا ہے تو کسی کو فرعون جیسی بھیانک موت ملتی ہے۔ اس لیے ہمارے حکمرانوں کو ایک بار تاریخ کے اِن واقعات پر نظر ڈال لینی چاہیے تب جا کر شاید انہیں اس حقیقت کی سمجھ آجائے اور وہ عوام سے کیے گئے تمام وعدے پورے کر دیں اور یہ ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔

کسی بھی ملک کی سیاست میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ کبھی کوئی سیاسی پارٹی اقتدار حاصل کرتی ہے تو کبھی کوئی اور پارٹی فتح حاصل کرتی ہے۔ لیکن کبھی یہ صورتِ حال بھی دیکھنے کو ملتی ہے کہ فوج سیاست میں مداخلت کرتی ہے اور ملک میں مارشل لاء نافذ کر کے اپنی حکومت قائم کر لیتی ہے۔ جونؔ ایلیا اپنے انشائیے "فی سبیل اللہ فساد" میں ایوب خان کے دور کے مارشل لاء کا ذکر کرتے ہیں۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو محمد ایوب خان اسکندر مرزا کو معزول کر دیا اور مرکز میں مضبوط مرکزی حکومت قائم کر دی۔ یہ دور مارشل لائ کا دور تھا اور یہ انقلاب پُر امن تھا۔ اس مارشل لائ کے دور میں ہر شعبۂ زِندگی میں اصلاحات نافذ کی گئیں جن کا مثبت اثر ہوا۔ انتظامیہ کو بدعنوان عناصر سے پاک کرنے کی مہم چلائی گئی۔ بڑے بڑے زمینداروں سے ان کی فالتو زمینیں لے کر مزارعین کو سونپ دی گئی۔ الغرض اس دور میں قوم ایک ہو کر سوچنے لگہ اور خیال کیا جاتا تھا کہ اس قوم کو اب پتا چل گیا ہے کہ کن باتوں سے اس ملک میں فتنہ جنم لیتا ہے اور قوم تباہ و برباد ہو جاتی ہے کیونکہ مارشل لائ کے دور میں اس قوم کو ترقی کرنے اور بنیادی مسائل کو حل کرنے کا موقع ملا تھا۔

اس لیے اس قوم کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ کچھ عرصے کے لئے یعنی ایوب خان کے دور میں یہ قوم ایک ہوئی تھی اور بنیادی مسائل کی طرف توجہ دینے اور اس کے حل کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی لیکن مارشل لاء کے ہٹتے ہی یہ پھر سے ان باتوں کی طرف اور ان مسائل میں اُلجھ گئے جو کہ کسی کی بھلائی کے لیے نہیں تھے

یعنی کہ اس قوم نے گزشتہ برسوں سے کچھ نہیں سیکھا اور وہی باتیں دہرانے لگے جو کہ اس کی تباہی و بربادی کا سبب بنتی ہیں۔

پاکستان کی سیاسی صورتِ حال آزادی کے ابتدائی سالوں کے بعد سے ہی اچھی نہیں تھی۔ سیاستدانوں کو صرف اپنا مفاد عزیز تھا۔ اظہارِ رائے اور اختلافِ رائے کی بھی آزادی نہیں تھی۔ لیکن جنرل یحییٰ خان کے دور میں یہ امید نظر آئی کہ اب عوام کو اپنی ذاتی رائے رکھنے اور اس رائے کے اظہار کی آزادی حاصل ہو گئی کیونکہ یہ دور جمہوری دور ثابت ہو رہا تھا اس دور میں عوام کو آزادی حاصل تھی۔ اور جنرل یحییٰ خان کے آتے ہی ملک میں امن و امان بحال ہو گیا اور جنرل یحییٰ خان نے دسمبر ۱۹۷۰ء کو ملک میں عام انتخابات کرانے کا حکم جاری کیا۔ اس طرح ہر ایک کو یہ حق دیا گیا کہ وہ اپنی رائے کا اظہار اپنے ووٹ کے ذریعے کریں۔ اس طرح اس دور میں جمہوریت کا اہتمام کیا گیا اور اس دور سے بہت زیادہ اُمیدیں لگائی گئیں کیونکہ گزشتہ کچھ ادوار سیاسی حوالے سے تسلی بخش نہیں رہے لیکن جمہوری دور ایسا دور ہوتا ہے جہاں اپنی رائے دوسروں تک پہنچائی جاتی ہے اور دوسروں کے خیالات اور ان کی آراء کو سنا جاتا ہے اور اس طرح اس جمہوری فضا میں سب ایک دوسرے کی رائے کا احترام کرتے ہیں اور اس سے اختلاف بھی کرتے ہیں لیکن اس سے جھگڑے کا ماحول نہیں بنتا بلکہ پورے صبر و تحمل کے ساتھ اور دلیل کے ساتھ معاملات طے ہوتے ہیں۔

اس سلسلے میں جونؔ کہتے ہیں:

> جمہوریت کا مزاج بولنے کا سلیقہ شعاری اور سننے کی جو بردباری سے عبارت ہے۔ جمہوری ہر اس نے خود کو لب کشائی کی دعوت دیتی ہے۔ جو کچھ بھی کہنا چاہتا ہو۔ جمہوریت کی صورت میں ہم ایک ایسی فضا کو قبول کرتے ہیں جس میں ہم سے کھل کر اختلافات کیا جا سکے۔ جو لوگ جمہوریت کی حمایت کرتے ہیں وہ گویا یہ چاہتے ہیں کہ معاملے دلیل سے طے ہوں نہ کہ طاقت سے۔ مخالف دلیلوں کو سنا جائے اور وعدوں پر نظر ثانی کی جائے۔ (۳)

جونؔ ان تمام باتوں کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہر معاملے میں ضروری نہیں ہے کہ صرف یہی حق اور سچ پر ہو اس لیے دوسروں کی رائے کو بغیر سمجھے غلط قرار نہیں دینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض معاملوں میں دوسروں کی رائے اور صداقت پر مبنی ہو۔ قوم کو یہ بہترین موقع ملا ہے کہ اپنی آواز دوسروں تک پہنچا سکے اور دوسروں کی آواز کو سُن سکے۔ اس لیے اس قوم کو یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

جونؔ ایلیا نے جنرل یحییٰ خان کے دور کے حوالے سے متعدد انشائیے لکھیں جس میں اس دور کے واقعات کو تسلسل سے بیان کیا گیا ہے۔ یحییٰ کے دور میں جمہوری دور کا آغاز ہوا تھا اور ایک نئی اُمید بندھی تھی کہ اب یہ ملک ترقی کی منازل طے کرے گا لیکن یہ امید دم توڑ دیتی ہے کیونکہ عام انتخابات کے بعد اکثریتی پارٹیوں نے ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی۔ ذوالفقار علی بھٹو اور شیخ مجیب الرحمن اقتدار کے لیے ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو گئے کیونکہ ایک پارٹی مشرقی پاکستان میں کامیاب ہوئی جبکہ دوسری پارٹی کو مغربی پاکستان میں فتح نصیب ہوئی اِس طرح یہ دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ ان تمام حالات میں بھارت نے مجیب الرحمن کا ساتھ دیا اور بھارت پاکستان کے داخلی معاملات میں دخل اندازی کرنے لگا۔

ان تمام حالات میں دونوں رہنما اقتدار چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ اور یہ صرف اپنے مفادات کے لیے سوچ رہے تھے۔ جس وجہ سے بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی جس کا فائدہ بھارت نے اُٹھایا اور مشرقی پاکستان کی پشت پناہی بھارت کر رہا تھا تاکہ پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہو جائے۔ کیونکہ بھارت شروع ہی سے پاکستان کے قیام کے خلاف اور اب اسے موقع مل گیا تھا کہ وہ پاکستان کو داخلی لحاظ سے توڑ دیں اور یوں یہ دور سیاسی حوالے سے حادثات کا دور ثابت ہوا حالانکہ ماضی کی تمام غلطیوں سے سبق سیکھ کر اب ہمیں عقل مندی سے کام لینا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اِس ملک کے سیاستدانوں اور دیگر اعلیٰ طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو اپنے مفادات سے بالاتر ہو کر صرف ملک و قوم کے لیے سوچنا چاہیے تھا۔ اور اس قوم کی بھلائی کے لیے فیصلے کرنا چاہیے تھے۔

صدر مملکت جنرل یحییٰ خان نے عوامی نمائندوں کو جلد اقتدار منتقل کرنے کا فیصلہ کیا لیکن شیخ مجیب الرحمن نے ملک کے حالات خراب کر دیئے۔ مجیب کا ساتھ بھارت نے دیا اور بھارت کا ساتھ روسنے دیا۔ اور یوں شیخ مجیب الرحمن نے ۲ مارچ کو ہڑتال کا اعلان کر دیا اور ملک میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا۔ غیر بنگالیوں پر حملے کیے گئے اور یہ غیر بنگالی جو مشرقی پاکستان میں سکونت اختیار کر چکے تھے اِن فسادات کا نشانہ بنے۔ انہیں انتقام کا نشانہ بنایا گیا۔ اور پھر جب ۲۵ اور ۲۶ مارچ کی رات کو بنگلہ دیش کے قیام کا اعلان کیا جانا تھا تو یحییٰ نے فوج کو حرکت میں آنے کا حکم دیا اور یوں فوج نے تمام بغاوت کو کچل کر رکھ دیا۔ اس طرح نفرت کی یہ فضا مزید پھیلی کہ جب وہاں فوج مسلط کر کے کشت و خون کا بازار گرم کیا گیا اور لاشیں گرائی گئیں۔ تو مغربی پاکستان کے لوگ یہاں جشن مناتے اور اس قتل و غارت پر خوش ہوتے۔ اور پھر مجیب الرحمن کی عوامی لیگ

نے بھارت کے ساتھ مل کر گوریلہ جنگ شروع کر دی اور اس میں بھارت کا ساتھ روس نے دیا اور یوں بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا اور بعد میں مغربی پاکستان پر بھی حملہ کر دیا یہ جنگ ۱۶، ۱۷ دسمبر تک جاری ہی اور پھر ۱۱ دسمبر کو ہتھیار ڈال دیے گئے اور بنگلہ دیش وجود میں آگیا اور اس سارے فسادات میں مغربی پاکستان کے وہ لوگ جو وہاں مقیم تھے بری طرح روند ڈالے گئے۔

ان تمام واقعات پر جونؔ غم و غصے کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب بھی مہلت ہے سدھر جاؤ اور وہ باتیں نہ دہراؤ جو کہ ہلاکت کا باعث بنے اور نصیحت عوام کو نصیحت کرتے ہیں کہ ان حکمرانوں سے دور رہو جو کہ اس معاشرے کی تعمیر میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اور ان فتنہ انگریز خطیبوں سے بھی بچ کے رہنا چاہیے اور ان کے بہکاوے میں نہیں آنا چاہیے کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے فتنہ انگیز تقریروں کے ذریعہ فساد برپا کرنے میں اپنا حصہ ڈالا۔ اس لیے آئندہ قوم کی ترقی میں کمربستہ ہو اور دوسروں کی باتوں اور بہکاوے میں نہ آؤ تب ہی تم اپنی منزل پا سکو گے۔

برصغیر کی تقسیم کے وقت آبادی کا بڑے پیمانے پر تبادلہ ہوا جس میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ ایسے تھے جو ہندوستان چلے گئے اور بہت سارے افراد ایسے تھے جو کہ ہندوستان سے آکر پاکستان میں آباد ہو گئے یعنی کہ کچھ نے پاکستان کو اپنا وطن قرار دیا اور بعض نے ہندوستان کو ۔ لیکن ایسے ہی کئی افراد ایسے ہیں جو کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے اور اسی کو اپنا وطن سمجھا کیونکہ ان کی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ تھیں اور وہ پاکستان میں رہنا چاہتے تھے لیکن انہیں بُری طرح ذلیل کیا گیا کیونکہ جب مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے الگ ہوا تو یہ افراد پاکستان کے اُس حصے میں بستے تھے جو کہ بنگلہ دیش کے حصے میں آیا۔ انہیں مشرقی پاکستان میں "بہاری" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہ گروہ ایسا ہے جس کو پاکستان کے ساتھ وفاداری کی سزا ملی اور جب مفادات ہوئے تو بڑے پیمانے پر اس گروہ کے افراد کو قتل کیا گیا اور اب جب بنگلہ دیش وجود میں آچکا ہے تب بھی ان سے ناروا سکول روا رکھا جا رہا ہے۔ کیونکہ انہوں نے حکمرانوں اور خطیب کے بہکاوے میں آکر پاکستان کا ساتھ دیا اور اب ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا جا رہا ہے اور یہ گروہ ایسا ہے جس کی جگہ اب نہ وہاں ہے اور نہ یہاں۔

جونؔ اپنے انشائیے "درد مندانہ" میں حکمرانوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے حکمرانوں کے لیے افسوس کا مقام ہے کہ انہیں ان معصوم پاکستانیوں کے دکھ اور تکلیف کا اندازہ نہیں کہ وہ وہاں موت سے زیادہ تلخ زندگی گزار رہے ہیں۔ انہیں کھلے دل کے ساتھ اِن غیر بنگالیوں کو اِس ملک میں پناہ

دینی چاہیے اور انہیں بنیادی سہولیات بھی فراہم کرنی چاہیے لیکن ہمارے حکمران بے حس ہو چکے ہیں اِس لیے وہ انہیں قبول کرنے کو تیار نہیں۔ ان کی نظر میں یہ اب بنگلہ دیش کے شہری ہیں لیکن حقیقت میں بنگلہ دیش کی حکومت اور وہاں کے شہری ان غیر بنگالیوں کو قبول نہیں کر رہی۔ اس لیے اگر یہ دونوں حکومتیں انہیں قبول نہیں کرتی تو عالمی برادری کو اس مسئلے کو حل کرنے چاہیے اور انہیں غیر آباد جزیرے میں منتقل کر دینا چاہیے جہاں یہ اپنی مرضی سے آزاد زندگی گزار سکیں۔

ادیب پاشا کسی بھی قوم کے قابلِ احترام افراد ہوتے ہیں۔ جو معاشرے کی اصلاح کا فریضہ وقتاً فوقتاً انجام دیتے رہتے ہیں۔ لیکن انہیں معاشرہ وہ مقام نہیں دیتا جو ان کا حق ہے۔ اس لیے جونؔ ایلیا اپنے انشائیے "افسوس" میں حکمرانوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ اس ملک میں جو بھی حکومت آتی ہے وہ ادیبوں پر توجہ نہیں دیتی بلکہ وہ ادیبوں سے بے گانہ رہی۔ کسی بھی حکومت نے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی اور نہ ہی کبھی ان کے لیے اقدامات کیے۔ لہٰذا یہ حکومتیں ادیبوں سے بالکل لاتعلق رہی لیکن جونؔ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت سے اِحوالے سے امید باندھتے ہیں کہ یہ حکومت ہو سکتا ہے کہ ادیبوں کے لیے اچھی ثابت ہو کیونکہ اس حکومت کا وزیر اطلاعات شاعر ہے۔

جونؔ مزید کہتے ہیں کہ اگر حکومت کے کسی عمل کی حمایت کی جائے، اسے سراہا جائے یا اس حکومت کے کسی بیان کی تائید کی جائے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ حکومت کا نمائندہ ہے بالکل اسی طرح اگر کوئی ادیب پاشا حکومت کے کسی فعل کی مخالفت کرتا ہے تو اس پر غدار ہونے کا الزام لگا دیا جاتا ہے حالانکہ ہر اچھے کام کو سراہا جانا چاہیے اور بڑے کام کی مخالفت کرنی چاہیے۔ چاہے یہ کام کوئی بھی حکومت کریں۔ اس لیے جونؔ کہتے ہیں کہ تمام واقعات سے سبق حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

انشائیہ "کم سے کم" س ۱۹ء میں لکھا گیا۔ اس سے پہلے ملک کے حالات سیاسی اعتبار سے بہت خراب تھے جس کی وجہ سے عوام بہت مایوس ہوئے اور ان کا اعتبار حکومت پر سے اُٹھ گیا تھا لیکن اب جب پاکستان کا آئین بنا تو عوام کو کچھ امید ہوئی کہ اب حکومت ملک کے متعلق سوچے گی اور اس کی ترقی کے لیے اقدامات کرے گی۔ جونؔ کہتے ہیں کہ پاکستان کا آئین ۲۵ سال بنا۔ جس طرح آئین کا معاملہ ہے اسی طرح اور بہت سے ایسے کام ہے جو کہ بہت پہلے ہو جانے چاہیے تھے لیکن ان میں مسلسل تاخیر ہوئی ہے اور ان تمام کاموں کی تاخیر کی اصل ذمہ دار حکومت ہے کیونکہ حکومت ہی ان مسائل کے حل کے لیے سنجیدگی سے غور نہیں کرتی۔ اور اقتدار میں آکر اپنے فرائض سے غفلت برتتی ہے اور صرف اپنے مفاد کے بارے میں سوچتی ہیں۔

لیکن اب جب پاکستان کا آئین بنا تو کچھ امید بحال ہوئی اور یہ آئین عوام کے لیے امید لے کر آیا کہ شاید اَب حالات کچھ بہتر ہو جائیں۔ اسی حوالے سے جونؔ کا ایک اور انشائیہ "آئین" بھی ہے جس میں آئین بننے کا ذکر ہے۔

وہ پاکستان جس کے لیے ہم نے اتنی قربانیاں دیں، اتنے فسادات ہوئے، اور لاکھوں لوگوں نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا اور اِن تمام کوشش اور قربانیوں کے بعد آخر ہم نے پاکستان کو حاصل کر لیا لیکن اس کی بنیاد نفرت پر رکھی گئی۔ کیونکہ جونؔ کے مطابق جس مسلم لیگ نے اِس وطن کو حاصل کرنے کا دعویٰ کیا تھا وہ مسلم لیگ ہندوئوں سے دشمنی کا سبق سکھاتی تھی۔ اور جب کسی ملک کی بنیاد میں نفرت شامل کر دی جائے تو اس ملک کا حال وہی ہوتا ہے جو کہ پاکستان کا ہوا اور پاکستان کو اس حالت تک پہنچانے والے ہم بھی ہیں۔ چونکہ مسلم لیگ کی بنیاد میں ہی نفرت تھی اس لیے آج پاکستان میں ہر گروہ دوسرے گروہ سے بیزار ہے۔ ہر علاقہ دوسرے علاقے سے نفرت کرتا ہے۔

جونؔ انشائیے "جائزہ میں یوں قمطراز ہیں:

> جس جماعت نے پاکستان بنایا ہے اس کی بنیاد ہی نفرت اور بیزاری پر تھی۔ بعض لوگ کہتے بھی رہے ہیں، لکھتے بھی رہے ہیں کہ پاکستان کی بقا کے لئے ہندوستان دشمنی ضروری ہے اور یہ کہ پاکستانی قومیت کی اصل بنیاد ہندوستان دشمنی ہے اور جو لوگ ہندوستان دوستی کی بات کرتے ہیں وہ ملک اور قوم کے دشمن ہیں۔ (۴)

جون کہتے ہیں کہ مسلم لیگ کو پاکستان حاصل کرنے کی داد تو بہت دی گئی لیکن اس بات پر کبھی غور نہیں کیا گیا کہ مسلم لیگ کی صرف تین شخصیات کو چھوڑ کر باقی تمام مفاد پرست اور خود غرض ہیں۔ محمد علی جناح، لیاقت علی خان اور خواجہ ناظم الدین ایسے رہنما تھے جو کہ واقعی عوام کے دکھوں کے ساتھی تھے۔ اور تعریف کے مستحق تھے۔ یہ مسلم لیگ جس طبقے کو پروان چڑھا رہی تھی وہی طبقہ پروان چڑھا اور اس طرح جاگیر دار، سرمایہ دار اور تاجر طبقہ پھلا پھولا۔ اور اس طبقے نے اس قوم کو تباہ کر دیا۔ اگر مسلم لیگ نے عوام کے بھلے کے لیے سوچا ہوتا تو اس ملک کو عوام کا ملک بنایا ہوتا۔ اس لیے یہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ اس ملک کے وجود میں آنے کے بعد سے اب تک اس ملک کو کس کس طریقے سے ترقی سے روکا گیا اور اس کو تباہ کرنے والا یہی طبقہ ہے جو کہ سرمایہ دار اور جاگیر دار کہلایا۔

جونؔ جہاں مسلم لیگ کے حامیوں کو بیان کرتے ہیں وہیں اپنے انشائیے "رُوداد" میں اس کی خوبیوں کو بھی سب کے سامنے لے کر آتے ہین۔ زندگی میں جو بھی کام کیا جائے اس کے کچھ نہ کچھ صفی ہونے چاہیے اور جب کوئی کام خلوص، لگن، ہمدردی اور جذبے سے کیا جائے گا وہ ضرور اپنے انجام کو پہنچے گا۔ جس طرح مسلم لیگ جو کہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تھی نے پاکستان کے حصول کے لیے جدوجہد کی۔ ان میں خلوص اور لگن موجود تھا۔ اس لیے اس نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لی۔ حالانکہ وہ دور مشکلات کے حوالے سے مشکل ترین دور تھا۔ اسی طرح جونؔ کہتے ہیں کہ یہ جذبہ ہی تھا جس کے تحت لاکھوں بے گھر افراد جو کہ ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ ان کا یہاں کے باشندوں نے پورے دل سے استقبال کیا۔

جونؔ اِن تمام باتوں کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلم لیگ میں جذبہ، لگن اور خلوص بے شک موجود تھا لیکن اِس ما مقصد شاید صرف پاکستان کا حصول تھا۔ اِس لیے اس نے آئندہ کے لیے کوئی لائحہ عمل نہیں بنایا۔ جس کی وجہ سے ابتدائی کے صرف دو یا تین برس ہی اچھے گزرے لیکن جونؔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اَب جو مسلم لیگ کی تشکیل تو ہو رہی ہے اور یہ پھر سے جنم لے رہی ہے اور یہ پورے ملک کی جماعت بن کر سامنے آنے والی ہے اس لیے اِس سے امید کی جا رہی ہے کہ اِس کے اندر قائد اعظم کی مسلم لیگ کی بنیاد خصوصیت یعنی کہ روشن خیالی ہونی چاہیے تب جا کر وہ اپنی منزل کو حاصل کر سکے گی۔

جونؔ ایلیا پاکستان اور ایران کی دوستی کے حوالے سے بھی بات کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ پاکستان اور ایران دو ایسے ممالک ہیں جن کے درمیان دوستی اور محبت کی فضا پائی جاتی ہے۔ یہ دوستی کچھ سالوں کی نہیں ہے بلکہ نسلوں سے چلتی آ رہی ہے۔ اور اسی سرزمین نے شیخ سعدی جیسے شاعر پیدا کیے جن کی کتب نہ صرف وہاں بلکہ پاکستان میں بھی برابر شوق سے پڑھی جاتی ہے جن میں سعدی کی حکایات قابلِ ذکر ہیں۔ جونؔ پاکستان اور ایران کی دوستی کے ساتھ اس نفرت کو بھی بیان کرتے ہیں جو کہ پاکستان اور بھارت کے مابین پائی جاتی ہے حالانکہ یہ دونوں ایسے ممالک ہیں جن کے درمیان گہری دوستی کا رشتہ ہونا چاہیے تھا کیونکہ مسلمان اور ہندو دونوں برصغیر میں کئی سالوں تک اکٹھے رہے اور تقسیم کے بعد بھی اب یہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے ہمسائے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے درمیان دشمنی کی کیفیت اس قدر گہری ہے کہ شاید اب اس کو ختم کرنا ناممکن ہو۔ اس نفرت کا ثبوت گاہے بگاہے ہمارے سامنے آتا ہے۔ جب ان دونوں ممالک کے درمیان کئی معاہدے ہوئے لیکن وہ تمام معاہدے اپنے انجام تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو گئے۔ اِسی طرح ۱۹۷۱ء کی

جنگ کے بعد جنگی قیدیوں کی واپسی کی بات ہوئی تو اس پر بھی بھارت نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ معاملہ بنگلہ دیش کی رضامندی کے بغیر حل نہیں کر سکتے۔ اس طرح یہ دشمنی وقتاً فوقتاً شدید ہوتی گئی۔

اِسی طرح جونؔ ایلیا اپنے ایک اور انشائیے " سمجھوتا" میں بھی اس دشمنی کو بیان کرتے ہیں جو کوئی برسوں سے چلی آرہی ہے۔ اور یہ دشمنی کم ہونے کے بجائے روز بروز بڑھتی جارہی ہے حالانکہ اس دشمنی سے نہ صرف پاکستان کو سوائے خسارے کے کچھ حاصل ہوا اور نہ ہی ہندوستان کو کچھ حاصل ہوا لیکن اس کے باوجود یہ دونوں ممالک اپنے اپنے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے بے انتہا نفرت رکھتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کا صرف نقصان ہی چاہتے ہین۔ حالانکہ اتنے برس گزر جانے کے بعد اب ان کو یہ بات سمجھ جانی چاہیے تھی کہ اس نفرت سے دونوں ممالک کا کچھ بھلا نہیں ہو رہا اور جتنی توانائیاں ہم ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے میں صرف کرتے ہیں اگر اتنی ملک کی ترقی کے لیے صرف کریں تو ہم ترقی یافتہ ممالک کی صف میں آجائیں۔ اور جو لوگ نفرتوں کی باتیں کرتے ہیں ہم ان کی باتوں کو سنتے اور ان پر دھیان دیتے ہیں۔ ہم یہ بات کیسے بھول گئے کہ ان دونوں ممالک کے باشندے برصغیر میں ایک ساتھ رہتے تھے اور اب جب تقسیم کے بعد ہم نے اپنا اپنا الگ ملک حاصل کر لیا تب بھی ہمارے موسم ایک ہے ہماری ہوائیں ایک ہیں۔ پھر ہم اِن چیزوں کو بدلے بغیر کیسے نفرت کو پروان چڑھا سکتے ہیں۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان نفرت کی ایک بڑی وجہ مسئلہ کشمیر ہے جس کو جونؔ اپنے انشائیے "جنت جہنم" میں بیان کرتے ہیں اور پنڈت جواہر لعل نہرو کو تنقید کا نشانہ بناتے ہین کہ کس طرح اِن کی کم ظرفی کی وجہ سے یہ مسئلہ آج تک حل نہ ہو سکا۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت کشمیر اور حیدر آباد کئی ریاست کا فیصلہ نہیں کیا گیا۔ کیونکہ کشمیر کا حکمران ہندو تھا لیکن آبادی کی اکثریت مسلمان تھی تو یہ گمان کہ اس کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہو گا لیکن ایسا نہ ہوا اور یہ مسئلہ آج تک جوں کا توں برقرار ہے حالانکہ کشمیری پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتے تھے اور اقوامِ متحدہ کا فیصلہ بھی یہی تھا کہ کشمیر میں استعوابِ رائے کرایا جائے اور کشمیر کی قسمت کا فیصلہ کشمیریوں پر ہی چھوڑا جائے لیکن ہندوستان ایسا نہیں چاہتا اس لیے آج تک کشمیر، پاکستان اور بھارت کے درمیان متنازعہ بنا ہوا ہے۔ اپنے اپنے طور پر ہر ایک نے اس معاملے کو حل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔

جونؔ کہتے ہیں کہ پاکستان اور بھارت دونوں ممالک کشمیر کے معاملے پر پیچھے ہٹنے کو تیار نہین اور یہ دونوں ہی کشمیر کا الحاق اپنے اپنے ملک کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں اور اسے اپنے ملک کا حصہ بنانا چاہتے ہیں لیکن

اِن دونوں ملکوں کی اپنی عوام بنیادی ضروریات سے مھروم ہیں۔ پاکستان کے حکمران اس جنت کو حاصل کرنے کے لیے سرگرداں ہیں لیکن اِن کے اپنے ملک کی عوام کی زندگی جہنم بنی ہوئی ہے کیونکہ یہاں لوگ محرومیوں میں زندگی بسر کر رہے یہں۔ اس سلسلے میں جونؔ کہتے ہیں:

> پاکستان کے صاحبانِ امیر وقت کا سب سے پہلا اور آخری مسئلہ کشمیر نہیں، پاکستان کے عوام ہیں جو بھوک، بیماری اور بھیانک محرومیوں مین جی رہے ہیں، مر رہے ہیں اور پاکستان کے صاحبانِ امر وقد کو اس کی کوئی پروا نہیں رہی ہے۔ میں اس جنت کو لے کر کیا کروں جو میرے لوگوں کے لیے جہنم بن جائے۔ (۵)

اس نفرت کو ختم کرنے کے حوالے سے جونؔ کہتے ہیں کہ پاکستان اور بھارت کی دشمنی جو کئی سالوں سے چلی آرہی ہے اس کو سیاست کے ذریعے اگر اگر حل کرنے کی کوشش کی جائے گی تو یہ دشمنی کبھی بھی ختم نہیں ہو گی کیونکہ آج تک سیاست سے مسائل حل نہیں ہوئے بلکہ سیاست مسئلوں کو مزید الجھا دیتی ہے اس لیے سیاست کی بجائے تاریخی حقیقتوں اور موجودہ حقیقتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اور پرانے اختلافات کو بھلا کر کوشش کی جائے تب جا کر صدیوں کی یہ دشمنی محبت اور دوستی میں تبدیل ہو گی کیونکہ اس دشمنی نے ان دونوں ممالک کو نقصان کے سوا اور کچھ نہیں دیا۔

جونؔ ملکی سیاست کے ساتھ ساتھ عالمی سیاست پر بھی قلم اٹھاتے ہیں۔ اور اس حوالے سے امریکا اور روس کی جنگ کے امکانات کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور امریکا کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ وہ روس کو ایٹمی جنگ پر اکسا رہا ہے حالانکہ امریکا جانتا ہے کہ اگر ان دونوں ممالک میں جنگ ہوئی تو اس سے نہ صرف ان دونوں ممالک کو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دیگر ممالک کو بھی نقصان اُٹھانا پڑے گا اور اگر ایٹمی جنگ ہو بھی گئی تو اس سے نہ صرف وقتی طور پر تباہ کاریاں ہو نگی۔ بلکہ کئی صدیوں تک یہ جنگ اپنے نشانات اور آثار چھوڑ جائے گی۔

اس لیے جونؔ کہتے ہین کہ یہ ممالک خود کو جدید تہذیب اور جدید ترقی کی صف میں تو کھڑا کرتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ آج بھی صدیوں پرانے وحشی دور میں سانس لے رہے ہیں جہاں انسانی زندگی کی کوئی قدر نہیں تھی۔ اور وہ سانس جسے انسانوں کے فائدے کے لیے بنا گیا تھا۔ آج نہی انسانوں کی زندگیاں چھیننے کے لیے اسے استعمال میں لایا جا رہا ہے۔ سائنسی میدان میں ترقی تو ہو رہی ہے لیکن سائنس کو سمجھنے اور اسے صحیح طور پر استعمال میں لانے کا طریقہ اور ہنر موجود نہیں ہے جس کی وجہ سے یہ ساری ترقی غلط سمت کی طرف جا رہی ہے۔ اور یہ تمام ممالک جو کہ خود کو طاقت ور سمجھتے ہیں اور اپنی تہذیب وضمانت کا دعویٰ کرتے ہیں یہ سب

دعوے وہ انہی ہتھیاروں اور سائنسی بنیادوں پر کرتے ہیں۔ اس لیے جونؔ کہتے ہیں کہ اگر آج تمام جنگی ادارے ختم کر دیئے جائے تو اِن کے پاس کچھ نہیں رہ جائے گا اور انہی اداروں کو ختم کرنا انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہو گی۔

اِسی طرح جونؔ ایک اور انشائیے "شرم ناک جرم" میں عالمی سیاست کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ اس انشائیے میں جونؔ نے ان ممالک کو اور اقوامِ متحدہ کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے جنہوں نے مغربی سامراج کے خلاف آواز بلند نہیں کی۔ جنہوں نے افریقہ کی تحریکِ آزادی کے ہیرو پیٹرس لوجمبا کو قتل کر کے اس پوری تحریک کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ مجرمانہ ذہنیت کے لوگ اس بات سے بے خبر تھے کہ اس طرح یہ تحریک دم توڑنے کی بجائے اب مغربی سامراجیوں کے حق میں بین الاقوامی عتاب کا ایک جہنم بن چکی ہے۔ وہ ممالک جو امن پسند ہے انہوں نے اس قتل کے خلاف آواز اُٹھائی اور اس حادثے کے مجرموں کو سزا دینے کا مطالبہ کیا اور ساتھ ہی اقوامِ متحدہ کو بھی اس معاملے میں اپنے فرائض پورے کرنے اور مجرموں کے خلاف مقدمہ چلانے کا کہا۔ لیکن کئی مماکل نے اپنی مجرمانہ ذہنیت کا اظہار کیا اور مجرموں کا ساتھ دیا۔ اس سلسلے میں اقومِ متحدہ کی حیثیت بھی مشکوک ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ اقوامِ متحدہ نے بھی صاف الفاظ میں بیان دیا ہے کہ ہمارا اس مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ کانگو کا داخلی معاملہ ہے جس کی وجہ سے اقوامِ متحدہ کو بھی تنقید کا نشانہ بنا گیا کیونکہ اگر یہ کانگو کا داخلی مسئلہ ہوتا تو دیگر مغربی ممالک میں بھی اِس حادثے اور قتل کے خلاف احتجاج شروع نہ ہوتا اِس لیے جونؔ کہتے ہیں کہ اقوامِ متحدہ کو اپنا اعتماد بحال کرنے کے لیے اِس معاملے کو حل کرنا چاہیے۔ ان مسائل پر تمام آزادی اور امن پسند ممالک کو حل کر سوچنے کی ضرورت ہے اور اس حادثے کے خلاف آواز بلند کرنے اور مجرموں کو سزا دلانے کے لیے ایک تحریک چلانی چاہیے تب جا کر انصاف پورا ہو گا اور ان کے قاتلوں کو سزا ملے گی۔

جونؔ ایک اور انشائیے میں عالمی سیاست کے حوالے سے بات کرتے ہوئے جنوبی افریقہ میں حکمرانوں کی درندگی کو بیان کرتے ہیں کہ وہاں کس طرح نسلی امتیازات کو اپنے عروج پر ہے اور کالے لوگوں کی نسل کشی کی جا رہی ہے۔ وہاں کے سفید فام حکمران وہاں کے اصل باشندوں کو تباہ و برباد کر رہے ہیں اور انہیں ان کے اپنے ہی وطن سے نکالنے کے درپے ہین۔ پہلے انسان جانوروں کی سی زندگی گزار رہا تھا لیکن اَب وقت بدل گیا ہے اور بیسویں صدی آگئی ہے لیکن انہیں شعور نہیں آیا۔ خاص کر مغربی ممالک کے رہنے والوں کو، حالانکہ یہ لوگ خود کو تہذیب یافتہ اور ترقی یافتہ کہتے ہیں۔

اِس سلسلہ میں جونؔ کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> نسلی امتیاز پسندی کا یہ بے ہودہ اور جاہلانہ خبط شریف انسانیت کے لیے قابلِ برداشت ہے۔ افسوس کہ نسلی غرور کے اس پاگل پن نے بعض مہذب ترین ملکوں سے تقویت حاصل کی ہے، ہم انسانوں کو ایشیائی، افریقی اور یورپی خانوں میں تقسیم کرنا جہالت اور حماقت خیال رکھتے ہیں۔ لیکن ہم کسی قوم کو ہدفِ ظلم و شقاوت بنتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔[۲]

جنوبی افریقہ کے ان بدمعاش اور جرائم پیشہ حکمرانوں کی اس بد تہذیبی اور درندگی نے دنیا میں نفرت اور غیظ و غضب کی ہر دوڑا دی ہے اور اس ظلم و بربریت اور نسلی تعصب کے خلاف امن پسند انسانوں نے اپنے ملکوں میں پُر زور احتجاج کیا۔ اس لیے جونؔ کہتے ہیں کہ ایسے افراد کو انسانوں کے درمیان رہنے اور بیٹھنے کا کوئی حق نہیں ہے اس لیے ایسے ظالموں کے خلاف سب کو مل کر ایک ہو کر آواز بلند کرنی چاہیے تا کہ ان جنوبی افریقہ کے عوام کو اِن کا جائزہ حق مل سکے۔

قیام پاکستان میں اگرچہ پاکستان کے ہر صوبے کا حصہ تھا اور تقریباً سبھی صوبے کے لوگوں نے قربانیاں دی ہیں لیکن اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو قیام پاکستان کے لیے سب سے زیادہ قربانیاں پنجاب اور پنجاب لے لوگوں نے دی ہیں۔ یہ وہ صوبہ تھا جو دو حصوں میں تقسیم ہوا اور اس کے لوگ بھی تقسیم ہوئے۔ کئی لوگوں کے آدھے رشتہ دار اُدھر رہ گئے اور کئی لوگوں کے اِدھر۔ ہجرت بھی سب سے زیادہ اِسی صوبے کے لوگوں نے کی۔ اس کے علاوہ آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا صوبہ ہونے کی وجہ سے استحکامِ پاکستان میں بھی اس صوبے کا بہت اہم کردار ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ صوبہ پاکستان کے پورے سیاسی اور سماجی منظرنامے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انشائیہ "ہمارا بھی کوئی گھر ہے" میں جونؔ اِسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

قیامِ پاکستان میں پنجاب کا اہم کردار ہونے کی وجہ سے پاکستان کی سیاست پر بھی پنجاب کے اثرات نمایاں اور بنیادی ہیں۔ پاکستان میں وہی پارٹی وفاقی حکومت میں شامل ہوئی ہے جو پنجاب میں اپنی اکثریت بنا لیتی ہے۔ جونؔ ایک شاعر اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی طور پر بھی ایک باشعور شخص تھے۔ اور مہاجرین سے تعلق ہونے کی بناء پر جونؔ کی زندگی کراچی میں گزری چونکہ قیام پاکستان کے لیے پنجاب کے بعد سب سے زیادہ قربانیاں مہاجرین نے دی تھیں لیکن ملکی سیاست میں اُن کا نمایاں کردار نہ ہونے کا ہر مہاجر

شاکی تھا۔ جونؔ بھی انہی افراد میں شامل تھے۔ انشائیہ "میرا گمان ہے" میں جونؔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور پنجاب کی سیاست میں اہم کردار کے ساتھ ساتھ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اہلِ کراچی خاص کر مہاجر طبقہ نہ صرف یہ کہ پاکستانی سیاست میں کوئی مقام نہیں رکھتا بل کہ اسے ملکی سیاست کے بارے میں یا تو کچھ علم ہی نہیں ہے یا پھر وہ جاننا ہی نہیں چاہتا لیکن محترمہ بے نظیر بھٹو جن کا تعلق سندھ سے ہے اُن کی سیاسی فہم و فراست کو دیکھتے ہوئے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ پنجاب کے سیاست دانوں کا نعم البدل ثابت ہو سکتی ہیں۔ جونؔ اِس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان کے خواص ہی نہیں عوام بھی سیاسی حوالے سے باشعود ہوتے جارہے ہین جو کہ پورے پاکستان کی خوش قسمتی کی علامت ہے۔

جدید دنیا مسلسل ترقی کی طرف گامزن نت نئے مشاہدات و تجربات کے بعد نئے نئے نتائج اخذ کیے جا رہے ہیں۔ سائنسی علوم و فنون نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور عالمِ اسلام کے سربراہان کوئی توجہ نہیں دے رہیں۔ سائنس کا بڑھتا ہوا ریلا ایک لحاظ سے آہستہ آہستہ تمام مذاہب کو پیچھے ہٹاتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے۔ ایسے عالم میں اگر کوئی مذہب سائنس کے اس بڑھتے ہوئے ریلے کے ساتھ مبتلا کر رہا ہے اور اس سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کر رہا ہے تو وہ اسلام ہے مگر عالمی سیاست شطرنج کے مہرے اس میں کسی قسم کا کوئی حصہ نہیں ڈال رہے۔ سیاسی اور سائنسی حوالے سے اسلام کے اس کردار کے سب سے بڑے دافع پاکستان اور ہندوستان کے مسلمان ہیں۔ حلانکہ اسلام کی تاریخی شہر جہاں سے ایک طرح سے اسلام کا آغاز ہوا۔ عرب، ایران اور عراق وغیرہ ہیں۔ لیکن وہ لوگ شاید اپنے مسائل میں اس قدر الجھے ہوئے ہیں کہ انہوں نے اسلام کی ساری کی ساری خوبیاں برصغیر کے مسلمانوں کے سپرد کر رکھی ہیں اور یہاں کے لوگ اسلام کے دفاع کے لیے مختلف ادارے قائم کر رہے یہں جن میں "اسلامی تحقیقی ادارہ" سرِ فہرست ہے۔ اس حوالے سے جونؔ نے عالمی سیاسی اور سائنسی منظر نامے میں اس ادارے کو امید کی ایک کرن کہا ہے اور اُمید ظاہر کی ہے کہ اس کے مستقبل قریب میں عالم اسلام کی سیاسی، سماجی اور سائنسی صورتِ حال پر بہترین نتائج مرتب ہوں گے۔ لیکن انہوں نے اِس کے حوالے سے چند سوالات بھی اُٹھائے ہیں جو واقع ہی اتنے اہم ہیں کہ ان کو نظر انداز کر کے شاید کسی قسم کے نتائج حاصل نہیں کیے جاسکتے۔

دنیا ترقی کی منازل طے کرتی چلی جارہی ہے۔ اقوامِ عالم اپنے مزاج میں نئی سی جدت پیدا کرتی چلی جا رہی ہے اور اس سب کی وجہ یہ ہے کہ اُن اقوام کے اربابِ سیاست نے اپنی اولین ترجیح تعلیم کو بنایا۔ جبکہ ہمارے ہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے ہم معاشرتی طور پر نااہل اور نکھٹو قوم کے فرد ہیں۔ ہمیں ہمیشہ کچھ

اچھانہ کرنے کے لیے بہانے چاہیے ہوتے ہیں جو بڑی آسانی سے ہمیں میسر بھی آتے ہیں اور ہم ان کو بنیاد بنا کر اپنے نکمے پن کو چھپا لیتے ہیں۔

یہ بات بالکل بجا ہے کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ دوسرے عوامل بھی معاشرے کی تشکیل اور تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ مگر ان کا کردار بنیادی نہیں ثانوی ہوتا ہے اور انہیں اتنی ہی اہمیت دی جانی چاہیے جتنی کہ ان کا حق ہے۔ مگر بد قسمتی سے پاکستان میں تعلیم کے علاوہ باقی ہر چیز کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اور ان میں کھیل بھی شامل ہے۔ تعلیم کے کھیل انسانی زندگی کا بنیادی جزو ہے۔ اچھی تعلیم کے لیے صحت مند دماغ کی ضرورت ہوتی ہے اور صحت مند دماغ کے لیے صحت مند جسم ضروری ہوتا ہے۔ اور صحت مند جسم کے لیے کھیل کود از حد ضروری ہوتے ہیں مگر ہمارے سیاستدان جسمانی بالیدگی کے لیے کھیلوں کا اہتمام تو کرواتے ہیں لیکن روحانی بالیدگی کے لیے تعلیم پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اقوام عالم میں سب سے پیچھے ہیں۔ انشائیہ "دماغ کے بطیر" میں جون ایلیاؔ اومیک گمیز میں پاکستان کی ہندوستان سے جیت اور اس حوالے سے منائے گئے جشنوں کے مناظر میں یہی بات واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ اگر ہم چیزوں کو بنیادی ترجیحات میں رکھتے ہوئے بنیادی ضرورتوں کو اِسی طرح نظر انداز کرتے رہے تو ہم اقوامِ عالم کے شانہ بشانہ چلنے کے قابل نہیں رہیں گے۔

تعلیم کے بجائے کھیلوں کو بنیادی ترجیحات میں میں شامل کرنے پر جونؔ کہتے ہیں:

> کھیلوں کے سلسلے میں ہم نے گزشتہ عرصے میں جس غیر ذمے دارانہ طرزِ عمل، بے اعتدالی اور ناقابلِ برداشت انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا ہے وہ بے حد تشویش ناک ہے۔۔۔ جن مشاغل میں دماغ سے کام لینے کی سب سے کم ضرورت پیش آتی ہے بل کہ بالکل ہی ضرورت پیش نہیں آتی وہی ہمارے سماج میں سب سے زیادہ عظیم اور عزیز قرار پاتے ہیں۔ جہالت کو جتنی رعایتیں ہمارے سماج میں دی گئی ہیں اس کی مثال شادی ہی کہیں مل سکے۔ (۷)

مسلمانوں کی سیاسی تاریخ اپنے اندر ایک ہمہ گیر وسعت لیے ہوئے ہے چونکہ دنیا کے طویل و عریض حصے پر مسلمانوں کی حکومت رہی، سو مختلف ادوار میں مختلف علاقوں میں مختلف خاندانوں کی حکومتیں قائم ہوئی، بنتی اور بگڑتی رہی۔ اس حوالے سے مختلف سیاسی حربے اور چال بازیاں بھی سامنے آتی ہیں۔ سیاست چونکہ امورِ حکومت کا بنیادی جزو ہے سو ایک اچھا بادشاہ جب تک اچھا سیاست دان نہیں ہو گا امورِ حکومت کو

اچھے طریقے سے سرانجام نہیں دے پائے گا۔ اس ضمن میں اس سے کوتاہیاں ہوں گی۔ سیاست کو بہتر طور پر سمجھنے والے لوگ جو اُس کے اِرد گرد موجود ہوں گے۔ اُس کا اثر ورسوخ اور عمل درآمد اُمورِ حکومت میں بڑھتا چلا جائے گا۔ اور حکمران اُن کے ہاتھوں ایک کٹھ پتلی کی حیثیت اختیار کر جائے گا۔

انشائیہ "بے تکی" میں جونؔ نے آخری مغل شہنشاہ کے دربار مین چلنے والی انہی سیاسی چال بازیوں کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ بہادر شاہ ظفر سیاسی چالوں سے بالکل انجان تھے اِس کے مقابلے میں انگریزوں نے اپنی سیاسی چالیں چل کر اُن کو اِس قدر کمزور بنا دیا اور اپنی جیت سے اِس قدر گمان کر دیا کہ جب جنرل بخت خان نے انہیں کہا کہ ہم "دلی ہارے ہیں دل نہیں ہارے" اور ہم اَب بھی لڑ کر جیت حاصل کر سکتے ہیں تو اُن کے انگریز نواز مصاحبوں میں سے ایک نے اس بات کی شدت سے مخالفت کی اور کہا کہ یہ پٹھان شروع سے ہی مغلوں کے دشمن رہے ہیں، سو آپ اِس پر یقین مت کریں۔

سیاست اپنے اندر ایک وسیع مفہوم لیے ہوئے ہے۔ اِس کا تعلق گلی محلوں سے لے کر شہروں تک اور ملکوں سے لے کر پوری دنیا تک کی حکومتی معاملات آجاتے ہیں۔ ترقی پذیر قومیں صرف اپنے ملک کی سیاست تک محدود رہتی ہیں جبکہ ترقی یافتہ ممالک سیاسی طور پر صرف اپنی سرحدوں تک محدود نہیں رہتے بلکہ اُن کی سیاست کا دائرہ کار اپنے آس پڑوس کے اُن ممالک تک بھی جاتا ہے جو کسی نہ کسی طرح اُن کو متاثر کر سکتی ہے۔ اگر ہم اس دائرے کو مزید بڑھائیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ چند بڑے ممالک جنہیں سُپر پاور کہا جاتا ہے۔ وہ پوری دنیا کی سیاسی و سماجی صورت حال کو نہ صرف متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ ایک حد تک اُس پر اثر انداز ہو بھی جاتا ہے۔ یہ ممالک اپنے مقاصد کے لیے دہشت گرد بھی پالتے ہیں۔ ان کی مالی امداد بھی کرتے ہیں، ظاہری طور پر اُن سے لڑتے بھی ہیں اور ان تمام سیاسی چالوں کے ذریعے پوری دنیا کے سیاسی نظام کو اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِن کی خواہش ہوتی ہے کہ دنیا میں کسی بھی طرح سے مکمل امن نہ ہونے پائے تاکہ دنیا کی سیاسی صورتِ حال مستحکم نہ ہو سکے اور پوری دُنیا اِن کے اشاروں پر چلتی رہے۔

انشائیہ "خلافِ قانون" میں مشہور فلسفی برٹرنیڈ رسِل کی قیام امن کی کوششوں، ایٹم بم کے خلاف مظاہروں اور اس وجہ سے اُن کے قید ہو جانے کے تناظر میں یہی بات بتانے کی کوشش کی ہے کہ عالمی امن کی داعی یہ قومیں درحقیقت خود نہیں چاہتی کہ دنیا میں امن آئے کیونکہ اِس سے عالمی سیاست میں اُن کا عمل دخل کم ہو جائے گا اور اُن کا استحکام اور بقاء خطرے میں پڑ جائے گی۔

فلسفیانہ موضوعات:

فلسفہ انسانی دانش و افکار کے ان گنت زاویوں اور نِت نئے امکانات کی نشان دہی کرتا ہے۔ فلسفے کو شروع ہی سے تمام علوم سرچشمے کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ فلسفہ یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی عقل و حکمت کے ہیں کسی بھی موضوع کی حقیقت اور تہہ تک پہنچنے کے لیے کی جانے والی عقلی جدوجہد کو فلسفہ کہا جاتا ہے۔ اس طرح فلسفہ کا اطلاق ہر اس علم پر ہوتا ہے جس میں ذہانت کا استعمال کیا گیا ہو، خواہ وہ محض علمی معاملات ہوں یا طبعی سائنس ہوں۔

ارسطو نے فلسفے کی جو تعریف کی ہے اس کے مطابق:

> فلسفہ کا کام ہے کہ وہ اشیاء کی ذات اور ان کی اہمیت اور صفات کا مطالعہ کرے کہ یہ اپنی فطرت میں کیا ہیں اور ان کے بنیادی اصول اور ضابطے کیا ہیں۔[۸]

انسان کے چاروں طرف پھیلی ہوئی دنیا بہت بڑی ہے، اس کی کوئی حدود انتہا نہیں۔ انسان بس یہ کر سکتا ہے کہ رفتہ رفتہ، قدم بہ قدم اس کی پہیلیوں کو بوجھے لیکن وہ کلی طور پر اس کا ادراک کبھی نہیں کر سکتا۔ فلسفہ اپنے آپ میں حامل ہے انسان کی مسلسل جستجو کی، لامحدود علم حاصل کرنے کی، ساری موجودات کے "علت و معلول" کا علم حاصل کرنے کی کاوش کا اور اس کے ماحصل پر شک کرنے کا۔ عہد قدیم کے فلسفی افلاطون کا سمجھنا بے معنی نہیں تھا کہ فلسفے کی ابتداء حیرت و استعجاب سے ہوئی ہے۔ پس فلسفہ عقل کے استعمال کا نام ہے۔

فلسفہ جا کے معنی عشق و حکمت اور دانش دوستی کے ہیں اور اِسی کے ذریعے سے ہم زِندگی کے اسرار و رموز کا پتا لگاتے ہیں اس کا تعلق عقل سے ہے۔ ہر زمانے میں بہت سے فلسفی ہو گزرے ہیں جو کہ اپنے اپنے وقت میں بہت قابلِ احترام تھے اور آج بھی اِن کی حکمت کے سب قائل ہیں لیکن جہاں عقل اور حکمت سے تعلق رکھنے والے اور سوچ بچار کرنے والے موجود ہوتے ہیں۔ وہاں عقل مخالف لوگ بھی جنم لیتے ہیں۔ جو کہ ہر طریقے سے علم و عقل کی مخالفت کرتے ہیں۔ اپنے انشائیے "فلسفہ شیطان کا شعار" میں جونؔ انہی لوگوں کے حوالے سے بات کر رہے ہیں کہ جس طرح ماضی میں فلسفیوں کو اور ان کے فلسفے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی اور علم و عقل کی مخالفت بھرپور طریقے سے کی گئی اور اس کے نتیجے میں دانش و حکمت کے پیروکاروں یعنی فلسفیوں کو سزائیں دی گئی جو کہ انتہائی بد فعل تھا اور آج بھی وہی باتیں دہرائی جا رہی ہے اور

علم رکھنے والوں کو لعن طعن کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ جس طرح ماضی میں فلسفیوں کو اہمیت نہیں دی گئی اسی طرح آج کے دور میں بھی انہیں اِن کا صحیح مقام نہیں دیا جارہا جو کہ انتہائی افسوس کی بات ہے۔

فلسفے کا تعلق عقل سے ہے۔ یہ تصورات سے ماخوذ ہے اور فکر کو ترقی دینے کا قائل ہے۔ فکر کو ترقی اور وسعت دے کر ہی فلسفے سے انصاف کیا جا سکتا ہے اور جب فکر کو وسعت دی جاتی ہے تب ہی ہم تمام فلسفیانہ سوالات کے جوابات ڈھونڈ سکتے ہیں اور کائنات کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس طرح فلسفہ انسانی فکر کا علم ہے۔ اس سے قطع نظر کہ فکر کرنے والا کس عقیدت سے تعلق رکھتا ہے یہیں ہمیں چاہیے کہ اسے انسانی ذہن کے ایک غیر جانب دارانہ فعل سے تعبیر کریں۔ فلسفے کو اپنے جذبات اور اپنی خواہشات کے تابع بنانا اسے فنا کر دینے کے برابر ہے۔ لہٰذا پاکستان کے فلسفیانہ حلقوں کو چاہیے کہ وہ اس کے اصل معنوں کو سمجھ کر اپنے ان فرائض کو انجام دینے کی کوشش کریں جو قوم کے ذہنی نمائندوں کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتے ہیں۔

اسی طرح جونؔ اپنے انشائیے "نجات" میں فلسفے کو نہایت خوبصورت انداز سے بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دنیا میں وہی قومیں ترقی کی منازل طے کرتی ہے جو دانائی اور حکمت کو اپناتی ہیں کیونکہ یہی وہ عوامل ہیں جو انسان کی ترقی کا باعث بنتے ہیں۔ آج تک جتنی قومیں اور سلاطین نے کامیابی حاصل کیں وہ اِس دانائی اور حکمت کے باعث حاصل کی۔ جو اِس حکمت کو اپناتا ہے وہ کامیابی پاتا ہے کیونکہ کامیابی کا راستہ یہی ہے۔ اِسی کے ذریعے سے مختلف قومیں کئی برسوں تک حکمران بنی رہی کیونکہ انہوں نے اس راستے کو چُنا تھا۔ اس طرح یہ حکمت اور دانائی کی دولت ان لوگوں کو ملتی ہے جو اسے تلاش کرتے ہیں اور یہ ایسی دولت ہے جو سونے اور چاندی سے بڑھ کر ہے اور اس میں وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ جو اس دولت کو تلاش کرے گا اور اسے اپنائے گا وہ ہی کامیابی کے زینے طے کرے گا۔ اِسی لیے تمام بنی نوع انسان کو اس کی تلاش میں سرگرداں ہونا چاہیے کیونکہ اِس میں ہماری اور آنے والوں کی نجات ہے۔

جونؔ حکمت کے حوالے سے اپنے انشائیے "نجات" میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> لوگو! کیا تمہیں یاد نہیں کہ حکمت زور سے پکارتی ہے اور دانائی اپنی آواز بلند کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے میں حکمت اور منشور کے ساتھ رہتی ہوں۔ سلاطین میرے ذریعے سے مسلط ہیں اور حاکم انصاف سے عدالت کرتے ہیں۔ امرا میرے ذریعے امارت کرتے ہیں اور رئیس زمین پر حکمران ہیں۔[۹]

جونؔ ایلیاء اپنے انشائیے "لفظ" میں فلسفیانہ انداز سے لفظ کی اہمیت بیان کرتے ہیں کیونکہ لفظ ہی تمام رشتوں کی بنیاد ہوتا ہے اور علم کی بنیاد بھی یہی لفظ ہوتا ہے اور لفظوں کی بنیاد پر ہی علم آگے بڑھتا ہے۔ اس لیے جونؔ کہتے ہیں کہ آج تک انسان نے دنیا مین جو کچھ بھی حاصل کیا وہ علم کی بدولت ہی حاصل کیا، سو انسان کی تمام حاصلات کو لفظ کا اعجاز بتایا گیا ہے۔ تمام رشتوں کا حاصل اور کھنا بھی اِسی سے ہے۔ اِسی کے ذریعے رشتے بنتے اور ٹوٹتے ہیں۔ انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور خیالات و اظہار کا تبادلہ کرنے میں بھی اِسی کا کمال ہے۔ اِسی کے ذریعے سے انسان سوچتا ہے سوالات کرتا ہے اور جب سوالات کرتا ہے تو نئے نئے زاویے اِس کے سامنے آتے ہیں اور پھر اِس کی فکر میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح انسان کے تمام حاصلات لفظ کی مرہونِ منت ہے۔

اس طرح جونؔ کہتے ہیں کہ لفظ خیال، خواب، حقیقت، حکمت اور عقل ہے۔ اِس کے بل بوتے پر انسان نے ترقی کی۔ اپنی دانائی کو کام میں لا کر دنیا کو فتح کیا۔ فن اور فکر کی نئی نئی جہتیں سامنے لائیں اور پھر اپنی تاریخ کی داستان رقم کی اور جس طرح ماضی میں انسان نے نئے نئے کارنامے سرانجام دیے، محنت کے معجزے دکھائے بالکل اسی طرح آج بھی لفظ سے یہی کام لینا چاہیے۔ کیونکہ اِسی میں نجات ہے۔

ادب میں لفظ اور معنی کی بحث کافی پرانی ہے۔ یہ ایک لازمی امر ہے کہ لفظ کا معانی سے رشتہ تلاش کیا جاتا ہے۔ لفظ اور معانی کا رشتہ ہی ادیب اور قاری کے درمیان ایک ایسی لڑی ہوتا ہے جو ان دونوں کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھتا ہے۔ لفظ اور معانی کا تعلق بعض کے نزدیک کچھ اور ہے اور بعض کے نزدیک کچھ اور اس تعلق کو بیان کرنے کے لیے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی اصطلاحیں سامنے آتی ہیں۔ لفظ کا معنی سے کیا تعلق ہے؟ کیا لفظ کا ادائیگی کے وقت کے حالات اور ادا کرنے والے کی ذات سے ہٹ کر معنی لیا جا سکتا ہے یا لفظ کے معنی کے لیے ہمیں اس لفظ کی ادائیگی کا عرصہ اور اس عرصہ کے حالات اور اس لفظ کے ادا کرنے والے کی ذات کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ یہ وہ مباحث ہیں جو ادب میں عرصہ قدیم سے چلتی چلتی آ رہی ہے۔ لفظ اور معانی کے فلسفے پر بہت زیادہ گفتگو ہو چکی ہے۔ کچھ کے نزدیک ہمیں کسی بھی لفظ کے معنی کے لیے اس لفظ کے لکھنے والے کے حالات اور اس دور کے حالات سے آگاہی ضروری ہے یعنی اُن کے نزدیک کسی بھی لفظ سے معنی مراد لیے جا سکتے ہے جو لکھنے والے کی مراد ہے لیکن دوسروں کے مطابق لکھنے والے نے جب لفظ لکھ دیا تو وہ اُس کا نہ رہا۔ اَب پڑھنے والے پر منحصر ہے کہ وہ اُس سے کیا معنی مراد لیتا ہے۔

جونؔ کے انشائیے "پہلا فرض" میں لفظ اور معنی کی اِسی بحث کے متعلق بات کی گئی ہے۔ ویسے بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو کسی بھی لفظ کا ایک معنی بہت کم ہی ہوتا ہے اور اکثر الفاظ کے معانی اُن کے لکھنے اور پڑھنے والے کی کیفیت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔

جونؔ ایلیاء لکھتے ہیں:

> کسی بھی لفظ کے صرف ایک معنی نہیں ہوتے، ایک سے زیادہ معنی ہوتے ہیں۔ اگر کسی اور زبان میں کسی لفظ کے صرف ایک معنی ہوتے ہیں تو ہوتے ہوں۔ کم سے کم میری زبان میں نہیں ہوتے۔ (۱۰)

وقت شاعری، نثر اور فلسفے کا اہم موضوع رہا ہے۔ زماں و مکاں کائنات کی ہر بحث کا بنیادی موضوع ہوتے ہیں۔ کیونکہ کائنات اپنی دو چیزوں سے مل کر تشکیل پاتی ہے۔ یہ بحث کہ پہلے زمان کی تخلیق ہوئی یا مکاں کی یا یہ بحث کہ زماں و مکاں حادث یعنی تخلیق کیے گئے یا قدیم یعنی خالق ہیں بہت پرانی ہے۔ تقریباً ہر بڑے فلسفی نے اس موضوع پر سوچ بچار اور اظہارِ خیال کیا ہے۔ معلوم فلسفے کے آغاز یعنی عہدِ یونان سے لے کر آج تک اور بیچ کے مسلمان دور کے فلاسفر نے زماں و مکاں کی اپنی تشریح کی۔ کچھ نے اپنے کسی پیش رو کی گئی تعریف کو آگے بڑھایا ہے تو کچھ نے الگ سے اپنا ایک نیا فلسفہ ہے۔

زماں یعنی وقت کی بہت سی تعریفیں تشریحیں ملتی ہیں۔ وقت کو تین اقسام میں تقسیم کیا گیا ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل۔ لیکن اِن تینوں کا یقین ایک مشکل امر ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سا وقت حال ہے کون سا ماضی اور کون سا مستقبل۔ بقول جونؔ جب آپ لفظ "قلم" بولتے ہیں تو اِس میں "ق" حال میں ہوتا ہے لیکن جیسے ہی آپ "ل" بولتے ہیں تو یہ ماضی بن جاتا ہے اور "ل" حال، جبکہ "ق" بولتے ہوئے "ل" مستقبل تھا۔

زمان کی ماہیت کے بارے میں مشہور فلسفی برگساں کہتے ہیں:

> تغیر کائنات کا ایک بنیادی اصول ہے یعنی یہ کہ تغیر لازمی ہے لیکن تغیر ایک تواتر نہیں ہے بلکہ یہ ایک دوران یا ایک سیل خود رو ہے۔ اس میں کوئی خلا نہیں ہے بلکہ یہ ایک کل ہے۔ ایک ایسا کل کہ جس میں ماضی حال میں مدغم ہوتا ہے اور مستقبل کی پیش بندی کرتا ہے۔ (۱۱)

افلاطون کے پیروکار فلسفیوں میں سے ایک فلسفی افلوطین نے وقت کو مدتِ حیات کیا۔ پروکلس نے وقت کو حرکت اور نفس سے جدا قرار دیا۔ مسلمان فلسفیوں میں عہدِ معتزلہ کے فلسفی ابو ہذیل علاف نے وقت کو اُن سب سے چھوٹے زروں کی حرکت بتایا ہے جن کو مزید چھوٹے حصوں میں تقسیم نہ کیا جا سکتا ہو۔ اُن کے نزدیک وقت حادثات یعنی تخلیق کیا گیا۔ انشائیے "وقت" میں جونؔ نے وقت، زمانے یا دور کے فلسفے کو بڑے خوب صورت انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس حوالے سے مختلف فلسفیوں کی آراء کو سمیٹنے کی کوشش کی ہیں۔ اِسی عنوان جونؔ سے جونؔ کا ایک اور انشائیہ بھی کتاب میں موجود ہے۔ اس میں بھی انہوں نے وقت کا فلسفہ ہی بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور ماضی، حال اور مستقبل میں وقت کی تقسیم کو بڑے خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اِس کے علاوہ اس انشائیے میں بھی انہوں نے مختلف فلسفیوں کے ہاں وقت کی تعریف کو بیان کیا ہے۔

وقت اچھا اور بُرا ہر طرح کا انسان کا اپنا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا اور یہ گزرتا رہتا ہے اس لیے جونؔ اپنے انشائیے "نیاں سال" میں وقت کے فلسفے کو بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ انسان پر منحصر ہے کہ اس لمحے، اس زمانے میں کیا کیا اور زمانہ صرف وقت سے منسوب نہیں ہے بلکہ یہ ہر شے پر محیط ہے۔ یہ وقت بھی ہے، انسان بھی ہے اور کائنات بھی ہے کیونکہ وقت گزر جاتا ہے یعنی زمانہ گزر گیا اور یہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا لیکن یہ گزر بھی رہا ہوتا ہے۔ کیونکہ زمانہ کائنات بھی ہے اِس طرح جو بیت گیا اس پر مایوس ہونے سے بہتر ہے کہ جو زمانہ اور وقت موجود ہے اس کی فکر کرنی چاہیے۔

اس طرح جونؔ کہتے ہیں کہ وقت گزر جاتا ہے اور مایوسی چھوڑ جاتا ہے لیکن گزرتے وقت پر مایوس ہونے سے بہتر ہے کہ موجودہ دور اور موجودہ زمانے کو اچھا بنایا جائے کیونکہ ایک خواب کے بعد دوسرا خواب جنم لیتا ہے اور اسی طرح ایک خواہش کے بعد نئی خواہشیں، خیال کے بعد نئے خیال اور خواب کے بعد نئے خواب کے ساتھ گزر بسر کرنا ہی زندگی ہے۔

جونؔ ایک قنوطیت پسند، یاسیت پسند اور وجودی بحران کے کرب میں مبتلا تھے۔ اُن کے نزدیک انسان کا وجود ہی انسان کا سب سے بڑا عذاب ہے۔ اُنہوں نے اپنی شاعری اور نثر میں معاشرے میں موجود تضادات اور منافقتوں کو بیان کیا ہے جو ہمارے معاشرے کا خاصہ ہے اور انسان کا مطلب پرستانہ، خود غرضانہ، لالچی اور حریص پہلو سامنے لایا۔ ان کے نزدیک انسان سہل پسند مخلوق ہے۔ آج کے دور کا انسان اپنی زندگی کے مقصد کو نہیں پہچان رہا بلکہ اُس کی زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں رہا وہ بے مقصد زندگی گزار رہا ہے اور بے

مقصد راستوں پر سفر کرتے ہوئے ایک ایسی منزل زندگی گزار رہا ہے اور بے مقصد راستوں پر سفر کرتے ہوئے ایک ایسی منزل کی تلاش میں جھٹک رہا ہے جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اُس کی زندگی کا کوئی مقصد باقی نہیں رہا اور بے مقصد ادھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارتا پھر رہا ہے۔

انشائیہ "مالی اراکم" میں جونؔ انسان کی یاسیت پسندی، وجودیت اور قنوطیت پسندی کا ایک خوبصورت عکس پیش کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ اس کی کینہ پروری، خود غرضی اور حرص کو بڑے فلسفیانہ انداز میں پیش کرتے ہوئے قیامِ پاکستان کا مقصد اور اس مقصد کے حصول پر بحث کرتے ہوئے یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ آج کا پاکستان نہ صرف قیامِ پاکستان کے مقصد کو فراموش کر چیا ہے بل کہ اپنی زندگی کے مقصد کو بھی بھولا ہوا ہے جو کہ ایک درست رویہ نہیں ہے اور آج کا پاکستانی وجودی بحران کا شکار ہے اور یاسیت پسند بن چکا ہے۔

جونؔ ایلیا بنیادی طور پر ایک یاسیت پسند فلسفی تھے۔ ان کے نزدیک انسان کا وجود ایک فضول اور لایعنی چیز ہے۔ انسان کی زندگی بے مقصد ہے اور کسی کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ انسان ایک بے مقصد زندگی گزار رہا ہے۔ اسے اِس بات تک کا علم نہیں کہ اس کی منزل کیا ہے وہ جس راستے پر چل رہا ہے اس کا انجام کیا ہو گا اور یہ راستہ کس منزل کو جاتا ہے اور جب ایک چیز بے مقصد ہو تو اگر وہ نہ بھی ہو تو اس کے نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا حالانکہ اس انسان کو اتنے دانش مند، حکمت ساز اور قابل انسان میسر آئے تھے جو ہر لمحہ اِسے ایک مقصد کی طرف بلاتے تھے۔ اِسے زندگی کا مقصد سمجھاتے تھے۔ اسے وہ سب باتیں بتاتے تھے جس پر عمل کر کے منزل کا حصول ممکن بنایا جاسکتا تھا لیکن اِس نے کسی کی بات پر کان نہ دھرے اور نہ ہی ان کی باتوں کو سمجھنے کی طرح سمجھا اور آج اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسان بے موت مر رہا ہے اور اسے اس خسارے کا علم ہی نہیں۔ اسے اس بات کا علم ہی نہیں کہ وہ جس راستے پر چل رہے ہیں اس میں صرف خسارہ ہی خسارہ ہے۔ اس لیے جونؔ کہتے ہیں کہ دانش مندوں کی باتوں کو سنو اِن پر کان دھرو اور انہیں سمجھنے کی طرح سمجھو اور پھر پورے قرینے سے اِس پر عمل کرو کیونکہ اِسی میں فلاح ہے اور جو کچھ گنوا چکے ہو اس سے سبق سیکھو تا کہ دوبارہ وہ کچھ نہ کرو جو آج تک کرتے آئے ہو۔

جونؔ اپنے انشائیے "جنتِ ارضی۔ 1" میں انسانوں کو دوسرے جانداروں سے افضل قرار دیا جانے پر فلسفیانہ انداز سے بحث کرتے ہیں اور یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسان اشرف المخلوقات اِسی وجہ سے ہے کہ وہ آگے بڑھنے کے خواب دیکھتا ہے یعنی کہ اس کے اندر آگے بڑھنے کا جذبہ موجود ہے اور اِسی بناء پر

اسے باقی جانداروں سے افضل قرار دِیا گیا ہے۔ اگر انسان خواب نہ دیکھتا تو آج بھی انسان وہیں کھڑا ہوتا اور اسی حالت میں ہوتا جہاں وہ ہزاروں سال پہلے تھا۔ اس نے ترقی نہ کی ہوتی، دنیا کو اپنے لیے نہ بدلا ہوتا۔ یہ اسی خواب کی بدولت ہی ہوا کیونکہ انسان جب بہتر سے بہتر کے خواب دیکھتا ہے تو اپنی حالت کو مزید بہتر بنانے کے لیے وہ جدوجہد کرتا ہے اور پہلے سے بہتر حالت میں آجاتا ہے لیکن انسان کے اندر بہتر سے بہتر کی یہ خواہش کبھی ختم نہیں ہوتی اور اگر انسان کے اندر یہ خواہش ختم ہو جائے اور وہ خواب دیکھنا چھوڑ دے تو پھر اس کا وجود ختم ہو جائے اور وہ خواب دیکھنا چھوڑ دے تو پھر اس کا وجود ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یعنی کہ انسان صرف آج کی فکر نہیں کرتا بلکہ وہ کل کا بھی سوچتا ہے جبکہ باقی جاندار صرف آج کا سوچتے ہیں۔ جونؔ کہتے ہیں کہ انسانوں میں بھی خواب کے حوالے سے مختلف لوگ پائے جاتے ہیں۔ جو سب سے اعلیٰ اور جاندار خواب دیکھتے ہے وہ فلسفی حکیم اور شاعر ہیں۔ اور یہ کسی بھی معاشرے کا وہ طبقہ ہے جو نہ صرف خود خواب دیکھتے ہیں بلکہ پورے معاشرے کو خواب دکھاتے ہیں اور پورے معاشرے کو بدلنا چاہتے ہیں۔ انسانوں کی حالت سدھارنا چاہتے ہیں۔ اِس لیے یہ معاشرے کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

انسان کو دوسرے جانداروں پر فضیلت دی گئی ہے اور انسان ہی ہے جو ترقی کے خواب دیکھتا ہے اور پھر اس کے لیے کوشش کرتا ہے۔ اس کی ان کوششوں اور جدوجہد کا مقصد اِن خوابوں کو پرا کرنا ہوتا ہے۔ جو یا تو انہوں نے دیکھے ہوتے ہیں یا حکیم اور فلسفی نے انہیں دکھائے ہوتے ہیں۔ عام انسانوں اور حکیم، فلسفی اور شاعروں کے خوابوں میں فرق ہوتا ہے۔ باقی انسان صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں اور ان کا مقصد اور حصول بہت دور کا نہیں ہوتا جبکہ یہ دانش ور اپنے معاشرے کے لوگوں کے بارے میں سوچتے ہیں اور ان کے خوابوں کے مقاصد اور اس کے نتائج بہت دور رس ہوتے ہیں اور جس معاشرے کے افراد خواب نہیں دیکھتے اور اپنی اسی حالت پر اکتفا کر لیتے ہیں ان کے حالات نہیں بدلتے اور وہ کبھی ترقی نہیں کرتے اور پھر ان کا وجود تک نہیں رہتا۔

جونؔ ایلیا کا انشائیہ "جنتِ ارضی-۲" بھی اس انشائیے سے جڑا ہوا ہے اور اسی کا تسلسل ہے۔ اِس انشائیے میں بھی خواب کے حوالے سے بات کی گئی ہے کہ پہلے لوگ دیکھتے تھے، سوچتے تھے اور پُر اُمید تھے کہ حالات بدلیں گے یعنی کہ ایک مثالی معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے خواب دیکھتے تھے لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، لوگوں کی سوچ میں بھی تبدیل آتی گئی اور اب وہ دور آچکا ہے کہ لوگ مایوس ہیں ان کے خیال میں حالات بدلنے والے نہیں۔

میری نسل کے سوچنے اور لکھنے والے لوگوں تک ایک مثالی معاشرے کے خواب دیکھنے
کا رواج عام تھا بل کہ میری نسل کے بعد کے لوگوں میں بھی یہ رجحان باقی رہا مگر اب
کئی برس سے یہ رجحان زوال پذیر ہے۔ نوخیز نسل نے خواب دیکھنے چھوڑ دیے ہیں۔[۱۲]

فلسفی جو کہ معاشرے کے وہ افراد ہیں جو پُر اُمید ہوتے ہیں جو ایک مثالی معاشرے کا خواب دیکھتے ہیں اور لوگوں کو حرکت و عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ اس انشائیے میں جونؔ بھی یہی بات کرتے ہیں کہ ہمیشہ اچھے کی اُمید رکھنی چاہیے لہٰذا اس دنیا کو ہم جنت تو نہیں بنا سکتے لیکن اپنی کوشش اور جدوجہد سے حالت بدل سکتے ہیں۔ آج تک جتنے بھی فلسفی گزرے ہیں وہ معاشرے کو یہی درس دیتے ہیں کہ کوشش، جدوجہد اور عمل سے ہم اس معاشرے کو حاسل کر سکتے ہیں جس کا ہم خواب دیکھتے ہیں کیونکہ محنت کا ثمر ضرور ملتا ہے۔

جونؔ ایلیا نے جو باتیں اپنے انشائیے "اٹکل" اور "جنتِ ارضی-1" میں کی تھی وہی باتیں وہ اپنے انشائیے "شعور" میں بھی دہراتے ہیں۔ اِس انشائیے میں بھی ان کی یاسیت پسندی نظر آرہی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ پُر امید بھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کا وجود بے مقصد ہے اس کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ انسان مستقبل کے ارادے باندھے جارہا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا وجود یکسر بے معنی ہے۔ اس کو اپنی منزل کا پتا ہی نہیں اور نہ صرف یہ بل کہ اس لفظ "انسان" کے معنی پر بھی پورا نہیں اُترتا کیونکہ لفظ "انسان" کے معنی خوش خلق، ملن سار اور ایک دوسرے سے مانوس ہونے کے ہیں لیکن انسان اِس کے برعکس رویہ اپنائے ہوئے ہے حالانکہ انسان وہ جاندار ہے جو مخلص، انصاف کرنے والا اور ادرست راستے کا انتخاب کرنے والا اور اس راستے پر چلنے والا ہو اور اپنے جیسے دوسرے انسانوں سے اُنس رکھتا ہو لیکن انسان اس کے برعکس عمل کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کا وجود بے معنی ہو چکا ہے۔ اگرچہ انسان وہ جاندار ہے جسے عقل اور علم کی بناء پر دوسرے تمام جانداروں پر فضیلت دی گئی ہے کیونکہ یہ شعود رکھتا ہے۔ اس لیے جونؔ کہتے ہیں کہ جہاں ایسے انسان موجود ہیں جن کی زندگی بے معنی و بے مقصد ہے وہیں اُمید کی روشنی بھی ملتی ہے اور ایسے انسان بھی اس دنیا میں بستے ہیں جو شعور رکھتے ہیں اور انسان کی زندگی کے مقصد سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کی زندگی ایک مقصد کے تحت چل رہی ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے شعور کی بدولت ہی اعلیٰ مقام حاصل کرتے ہیں اور حالات کو بہتر بناتے ہیں۔ اس لیے اس انشائیے میں یاسیت پسندی کے ساتھ ساتھ رجائیت بھی نظر آتی ہے اور انسان اسی شعود کو بیدار کر کے اس سے صحیح کام لے کر اعلیٰ مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

جونؔ ایلیا یاسیت پسندی ان کے انشائیے "پھوہڑ" سے بھی واضح ہوتی ہے یعنی کہ وہ اپنے ہونے اور نہ ہونے کے کرب میں مبتلاے ہ کیونکہ انسان شعور نہیں رکھتے، اپنی حالت کو بہتر بنانے کے لیے جدوجہد اور کوشش سے کام نہیں لیتے بلکہ اپنی حالت پر اکتفا کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے جونؔ کہتے ہیں کہ اِن کے شعور کو بیدار کرنے کے لیے اگر کچھ کیا جائے اور بولا جائے تو اس میں بھی دُکھ کے سوا کچھ نہیں کیونکہ یہ لوگ سنتے تو ہیں لیکن سننے کی طرح نہیں سنتے اور نہ ہی سمجھتے ہیں۔ اور اگر کبھی سُن لیں تو مانتے نہیں اور نہ ہی اس پر عمل کرتے ہیں۔ اس لیے ایک کرب اور کچھ کی صورت حال ہے کیونکہ اگر ان کی بہتری کے لیے کچھ نہ کیا جائے اور انہیں ان کی بھلائی کا راستہ نہ دکھایا جائے تب بھی کرب کی کیفیت طاری رہتی ہے اور اگر کچھ کیا جائے تب بھی اِسی کرب میں مبتلا رہنا پڑتا ہے کہ لوگوں نے سنا تو ہے لیکن نہ ہی سمجھا اور نہ ہی اس پر عمل کیا ہے۔ اس لیے اس انشائیے میں جونؔ اسی کیفیت سے دوچار ہے کہ ہونے سے بھی کوئی فائدہ نہیں اور نہ ہونے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اِسی طرح ایک اور انشائیے "خیر اعلیٰ کی قسم" میں بھی جونؔ فلسفہ یاسیت پر بحث کرتے ہیں چونکہ دانش فرد اور شاعر معاشرے کے اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو بہت حساس ہوتے ہیں اور عام لوگوں سے زیادہ کسی چیز کو محسوس نہیں کرتے ہیں۔ اس لیے وہ نہ صرف اپنے دکھوں پر کڑھتے ہیں بلکہ وہ دوسرے لوگوں کے دُکھوں میں بھی برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ دوسروں کے غموں اور دُکھوں میں بھی برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ دوسروں کے غموں اور دکھوں کو اپنا دکھ سمجھتے ہیں اور اس کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے فلسفی ایک مثالی معاشرے کا خواب دیکھتا ہے جہاں ہر شخص خوشحال ہو اور ان غموں اور دُکھوں سے دور ہو۔ اِس کے لیے وہ لوگوں کو ایسا راستہ بتاتے ہیں جس پر چل کر اپنی منزل کو حاصل کیا جاسکتا ہے اور فلسفی جو کہ عقل اور حکمت کا قائل ہوتا ہے وہ سوچ بچار کرتا ہے اور ان کی نگاہ وقتی فائدے پر نہیں ہوتی وہ دور کی سوچتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ جونؔ اِس انشائیے میں ماضی کے فلسفی افلاطون کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ افلاطون سقراط کا شاگرد تھا اور اس نے سقراط سے ہی علم و حکمت کی تعلیم حاصل کی تھی۔ خیر اور شر کا تصور نام ور فلسفی سقراط نے ہی پیش کیا تھا۔ اس کے مطابق دو قوتیں ہر وقت برسرِ پیکار رہتی ہے۔ ایک اچھائی اور دوسری بُرائی۔ بدی نیکی پر غالب آنے کی ہر وقت کوشش کرتی ہے لیکن نیکی غلبہ پالیتی ہے یہ دونوں قوتیں شروع ہی سے ٹکراتی رہی ہے۔ یہ اس وقت سے ٹکرانا شروع ہوئی جب خدا نے فرشتوں سے کہا تھا کہ وہ زمین پر اپنا

جانشین یعنی خلیفہ بنانا چاہتا ہے۔ تب اس فیصلے کے خلاف بدی کھڑی ہوئی اور یوں اس وقت سے یہ دونوں ہمیشہ ٹکراتی رہی۔ اس لیے سقراط خیر اعلیٰ یعنی کہ خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ برائی ہمیشہ ہارتی ہے اور نیکی کو فتح نصیب ہوتی ہے۔

یاسیت پسندی جونؔ کی سرشت میں تھی جو ان کی شاعری اور نثر دونوں میں نمایاں ہو کر جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جونؔ ایک یاسیت پسند آدمی تھے اور وہ اکثر اپنی رائیگانی کا اقرار کرتے نظر آتے ہیں۔ اُن کے انشائیوں میں ان کی یاسیت پسندی بہت زیادہ واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ اکثر انشائیوں میں اگرچہ ان کا موضوعِ سخن کچھ اور ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ان میں یاسیت پسند جونؔ ایلیا کہیں نہ کہیں سے جھلکتا ہوا ضرور نظر آتا ہے۔ ان کا انشائیہ "دونوں سے" اگرچہ بنیادی طور پر ایک سیاسی انشائیہ ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس میں انہوں نے یاسیت کے فلسفے کو بھی بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

جونؔ کے مطابق یہ کائنات اور اس میں موجود ہر چیز صرف فانی ہی نہیں بے مقصد اور لایفی بھی ہے۔ انسان جہاں ہے اور جس حالت میں بھی ہے وہ بے امانی کی حالت میں ہے اور پُر زیانی یعنی نقصان اور خسارے کی حالت میں ہے اور جونؔ اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ میں اس دنیا سے ہٹ کر کوئی انسان نہیں۔ بلکہ میں بھی دوسروں کی طرح ہی مسلسل رائیگانی کی کیفیت سے گزر رہا ہوں۔

اِنسانیت کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے کہ کوئی بھی انسان کسی دوسرے انسان سے کم تر یا برتر نہیں ہے بلکہ سارے انسان برابر۔ خُدا نے سب انسانوں کو برابر فضیلت اور حیثیت دی اور کسی کو دوسرے سے کم تر نہیں کہا لیکن یہ انسانوں کی بے دانشی ہے کہ وہ علم و حکمت سے بابلد ہے وہ شعود نہیں رکھتے انہیں اس بات کا احساس اور شعور ہی نہیں کہ جب خدا نے تمام انسانوں کو ایک جیسا مقام دیا ہے تو ہم اس مختلف گروہوں میں بانٹ کر یا انفرادی طور پر ہی برتر یا کم تر کیسے کہہ سکتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال صرف اسی صورت میں پیدا ہوتی ہے جب انسان عقل سے کام نہیں لیتا اور بے عقلی اور بے دانشی کے میدان میں بھٹکتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں اِسے فلسفیانہ حقائق سے استفادہ کرنا چاہیے اور فلسفے کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ جو اسے حقیقت سے آشنا کراتی ہے اور انسانوں کو صحیح مقام سے آگاہ کرتی ہے تب انسانوں کے درمیان موجود خلا پُر ہوتا ہے۔

جونؔ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کے قائل تو ہیں لیکن وہ اِس پر سوال بھی اُٹھاتے ہیں۔ ان کے سوالات بنیادی نوعیت کے ہوتے ہیں مثلاً انسان کو اشرف المخلوقات کس نے قرار دیا ہے جب کہ دوسری بہت ساری مخلوقات بہت سارے عادات و اطوار میں اور بہت ساری چیزوں میں انسان سے اچھے ہیں لیکن پھر

یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ انسان سے کم تر ہو اور انسان ان سے برتر ہو۔ ایک عام مثال ہے کہ کتا کتے کا گوشت نہیں کھاتا مگر انسان ان مخلوقات میں سے ایک ہیں جو اپنے ہی بھائی بند کو بغیر کسی وجہ کے یا بہت ہی معمولی وجہ کے قتل کر ڈالتا ہے۔ ایک دوسرے سے منافقت کا رویہ رکھتا ہے جب کہ جانوروں میں یہ برائیاں بہت کم ہی نظر آتی ہیں۔ اس کے باوجود انسان نے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ کائنات اُس کی ہے اور اس کائنات کی ہر چیز کا وہ اکیلا ہی مالک ہے اور اس میں وہ کسی جانور کی تو ایک طرف سے کسی دوسرے انسان کی ملکیت تک برداشت نہیں کرتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو اس کی ملکیت کا اختیار کس نے دیا۔

انسان اپنی آسائش کے لیے اور آرام و سکون کے لیے جانوروں کو پکڑتا ہے اپنے مقصد کے لیے انہیں پالتا پوستا ہے۔ اور مقصد کے لیے کاٹ کر کھا بھی جاتا ہے۔ یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ انسان اگر کسی جانور مثلاً شیر یا چیتے کو مار ڈالے تو انسان بہادر شکاری وغیرہ القابات سے نوازا جاتا ہے اور وہ بڑے فخر سے اِس کی کہانیاں سنتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر کوئی جانور اِس کی جان لے لیں تو وہ جانور خوں خوار، پاگل اور وحشی وغیرہ کہلاتا ہے۔ اور پہلا موقع ملنے پر ہی اُسے مار دیئے جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

انشائیہ "جو بڑے کہلاتے ہیں" میں جونؔ ایلیا اسی قسم کے سوالات اُٹھاتے نظر آتے ہیں کہ انسان جو بڑے کہلاتے ہیں کیا وہ بڑے کہلائے جانے کے مستحق ہے کیا وہ اِس قابل ے ہے کہ انہیں صحیح معنوں میں اشرف المخلوقات قرار دیا جاسکے؟

انسان وہ مخلوق ہے جسے اشرف المخلوقات کا تاج پہنایا گیا۔ اسے عقل دی گئی، شعود دیا گیا، فہم و ادراک سے نوازا گیا اور ایک جھنڈ کی صورت میں رہنا اور ایک دوسرے کے کام آنا سیکھایا گیا۔ اپنے ہونے اور نہ ہونے پر سوچنا بھی سکھایا گیا اور اسی لیے انسان کو "سماجی جانور" کہا جاتا ہے۔ ازل سے انسان اپنے ہونے اور نہ ہونے کی ایک عجیب سی کیفیت میں اُلجھا ہوا ہے۔ انسان اپنی حقیقت کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے وہ کون ہے کہاں ہے؟ کس لیے ہے اور یہ بھی کہ در حقیقت وہ ہے بھی کہ نہیں۔ اگر وہ ہے تو کس طرح کا ہے۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر یہ ہونے کا احساس کیا ہے۔ یہ بحثیں عہدِ قدیم کا فلسفی کرتا چلا آرہا ہے اور آنے والے زمانے تک اِن بحثوں کا اختتام ہوتا نظر نہیں آرہا۔

جونؔ ایک یاسیت پسند شاعر اور نثر نگار تھے۔ اگرچہ جونؔ بذاتِ خود اِس حقیقت کو جھٹلاتے نظر آتے ہیں لیکن یہ یاسیت پسندی ان کی شاعری اور نثر سے واضح اور صاف انداز میں جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کے انشائیے پڑھنے سے اُن کے ہاں جو زِندگی کا کرب نظر آتا ہے جو ہونے اور نہ ہونے کی بحث نظر آتی ہے وہ اِس

بات کا بین ثبوت ہے کہ جونؔ ایک یاسیت پسند اور یاسیت زدہ ادیب ہیں۔ انشائیے "ایک نام" میں بھی جون کی زندگی کا یہی پہلو واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ اِسی طرح اِس انشائیے میں انسانی فطری منافقت کا ذکر بھی کیا ہے۔ انسان چونکہ طاقت ور ہے اِسی لیے اس نے خود کو ہی اشرف المخلوقات بنالیا ہے۔ جونؔ کہتے ہیں کہ چونکہ ہم اسی مخلوق سے تعلق رکھتے ہیں اسی لیے باوجود اس کے کہ مجھے ایک جنس اچھی نہیں لگتی اِس کے ساتھ نباہ کرنا ہے۔

جونؔ ایلیاء لکھتے ہیں:

> میں تمہاری اس زمین کو گھورے کی مکھیوں کے پروں سے لِسی اور لتھڑی ہوئی گند سے بھی زیادہ گھٹیا اور گھناءنا جانتا ہوں کہ اس پر یہ ابنیڈا جان دار انسان کُلبلاتا ہے۔ پر سوچنے کی جو بات ہے وہ یہ ہے کہ اگر ہم اس اینڈے بیڈے سے نباہ نہ کریں تو پھر کیا کریں۔ (۱۳)

اس انشائیہ "نشان کے تین سوالات" میں انسانی سوچ اور شعور پر فلسفیانہ گفتگو کی گئی اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ تمام انسانوں کی فکر میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک شخص اگر کسی حوالے سے اپنی کوئی رائے قائم کرتا ہے تو اس کے مقابلے میں دوسرا شخص ایک الگ رائے رکھتا ہے یعنی کہ ہر ایک کے دیکھنے کا زاویہ اور سوچ دوسرے انسانوں سے الگ ہوتی ہے لیکن ہر انسان جو سوچتا ہے وہ اپنے آپ کو اس میں ٹھیک سمجھتا ہے۔ اس کے پاس اپنی سوچ کے لیے دلیلیں موجود ہوتی ہیں اور وہ اپنی سوچ اور رائے کو درست اور دوسروں کی رائے کو غلط تصور کرتا ہے حلانکہ زندگی کے آخری لمحے میں ہمیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ ہم سب نے راستے تو الگ الگ چُنے تھے اور ان راستوں پر چل رہے تھے لیکن ہم سب کی منزل ایک ہی تھی لیکن راستے جدا تھے۔ اگر اس حقیقت کا پہلے علم ہو جائے تو پھر درست اور غلط کے تمام جھگڑے شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔

اِن تمام باتوں کے ضمن میں جونؔ یہ مثال پیش کرتے ہیں کہ جس طرح عقیدے اور مسلک کے حوالے سے ہر ایک کی سوچ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ سنی اور شیعہ ایک دوسرے پر الزامات کی بوچھار کرتے رہتے ہیں اور دونوں مسلک سے تعلق رکھنے والے خود کو صحیح اور اپنے حریف کو غلط ثابت کرنے کے لیے دلائل لے کر آتے ہیں لیکن یہ دونوں اس حقیقت کو جان لیں کہ حقیقت اور صداقت کا سارا سرمایہ ان میں

سے کسی ایک فریق کے پاس نہیں ہے۔ اِس لیے ہر ایک کی سوچ اور فکر کا احترام کرنا چاہیے اور سوچ کے اس اختلاف پر جھگڑنے سے پہلے یہ جان لیں کہ تمام انسانوں کی سوچ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

مختلف قوموں کے عروج و زوال کا بہت خوبصورت اور فلسفیانہ انداز میں ذکر کیا گیا ہے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہی قومیں ترقی کرتی ہے جو خود پر اعتماد کرتی ہے۔ شعور سے کام لیتی ہے۔ علم و حکمت اور دانش و عقل کو اپنا رہنما بناتی ہے۔ جونؔ کہتے ہیں کہ اگر ہم ماضی کی طرف دیکھیں تو بہت ساری ایسی قومیں ہمیں نظر آتی ہے جو کہ عروج کی بلندیوں کو چھو گئی کیونکہ انہوں نے دوسروں پر بھروسا کرنے کے بجائے خود پر اعتماد اور بھروسا کیا۔ حکمت کی طرف رجوع کیا اور جب انہوں نے علم کو اپنا رہنما بنایا تو اس نے ترقی کے زینے چڑھے۔ اس لیے جونؔ کہتے ہیں کہ جس طرح پہلے بھی حکمت و دانائی کو بلند مقام حاصل ہوا اور اس کی بناء پر انسانوں نے بلند مقام حاصل کیا اَب بلندی کو چھونے کا یہی راستہ ہے جس کو اپنا کر اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کیا جاسکتا ہے اور ان قوموں کے مدِ مقابل آیا جاسکتا ہے جو بلندی پر پہنچ گئی ہیں۔

دورِ حاضر کے ہندوستانی مورخ لکھتے ہیں کہ:

> فلسفیانہ حکمت کا مقصد صرف ذہنی تجسس کی تشفی ہی نہیں بلکہ خاص طور پر بہتر زندگی کا حصول ہے جو دور بینی سے، پیش بینی سے اور گہری درون بینی سے روشن ہو۔ (۱۴)

اخلاقیات انسانی معاشرت کا بہت اہم جُزو ہوتے ہیں۔ فلسفۂ اخلاقیات کو انسانی معاشرت میں بنیادی حیثیت حاصل ہے کیونکہ انسان کو جانوروں پر فوقیت حاصل ہونے کا بنیادی سبب اس کی جانوروں پر اخلاقی برتری ہے۔ بعض اخلاقی فضائل جو اچھائی ہوتے ہوئے بھی بعض فلاسفہ کے نزدیک بُرائی سمجھے جاتے ہیں اُن میں سے ایک ملن سار رویہ ہے۔ حضرت علی کے قول کا مفہوم ہے کہ جس شخص کا کوئی دشمن نہیں ہوتا وہ درحقیقت منافق ہے کیونکہ ایک شخص کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ بیک وقت ہر شخص سے اتفاق کر سکے اور ہر شخص کو خوش رکھ سکے۔ انشائیہ "مبارک ترین" میں جونؔ نے فلسفۂ اخلاقیات کے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کے مطابق ملن سار انسان یزداں یا اہرمن تو ہو سکتا ہے مگر انسان نہیں ہو سکتا کیونکہ ایک انسان کا کوئی نہ کوئی مخالف یا دشمن ضرور ہوتا ہے۔

جونؔ ایلیا نے اپنے انشائیے "وقت کے دوام میں" زندگی کا فلسفہ بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ انسان کی زندگی آج کے دور میں ضائع جا رہی ہے اور انسانی فکر کا بنیاد موضوع خدا بن چکا ہے حالانکہ اصل موضوع انسان ہونا چاہیے تھا لیکن انسان کو ہمیشہ عقیدے سے متعلق سکھایا اور بنایا گیا۔ انہیں انسانوں سے تعلقات رکھنے اور

ان کی بہتری کے حوالے سے سبق نہیں دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج انسان انسان کا دشمن بنا ہوا ہے۔ عقل کو عقیدے کا غلام بنا دیا گیا حالانکہ عقیدے اور اقدار میں توازن قائم ہونا چاہیے تھا تب جا کر سب کے ساتھ انصاف ہوتا لیکن اِن تمام حالات اور اسباب کی وجہ سے چار سو جہالت کے اندھیرے بکھرے ہوئے ہیں۔ ہر دور کی طرح اس دور میں بھی سچ بولنے والے اور اپنی آواز دوسروں تک پہنچانے والے موجود ہیں لیکن ان کی آواز سننے والا کوئی نہیں۔ اسی سے انسان سوچتا ہے اور کائنات کی ہر چیز پر غور کرتا ہے جس سے اِس پر بہت سے اسرار و رموز کھلتے ہیں اور پھر وہ اِس دنیا کے مقصد اور انسان کے وجود میں آنے کے اعلیٰ مقاصد سے آشنا ہوتے ہیں لیکن جب عقل کو ہی مفقود کر دیا جائے اور اسے ہی عقیدوں کا غلام بنا کر رکھ دیا جائے تو پھر اس سے سوچنے، سمجھنے اور پرکھنے کا کام نہیں لیا جا سکتا۔ جس کے نتیجے میں انسانوں میں افراتفری دکھائی دیتی ہے کیونکہ وہ غور و فکر کی صلاحیتیں کھو بیٹھتے ہیں اور انسانوں سے ہمدردی کے رویے کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی جونؔ یہ بھی کہتے ہیں کہ جلدی میں خدا نے اس دنیا کو بنایا ہے اِسی لیے اس کی یہ حالت ہے کیونکہ اتنی جلدی میں ایسی ہی دنیا بن سکتی تھی جہاں سب ایک دوسرے کو مار رہے ہوں اور ایک دوسرے کے دشمن بن جائے۔

جونؔ کا اندازِ تحریر فلسفیانہ ہے۔ سادہ سی بات کو ایک ایسے خوب صورت انداز میں بیان کرتے ہیں کہ وہی سادہ بات ایک فلسفیانہ بحث معلوم ہوتی ہے۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ انہوں نے اپنے انشائیوں میں فلسفے کی بھی بہت ساری ابحاث چھیڑیں ہیں لیکن کہیں تو ایک سادہ سی بات کو خوبصورت فلسفے میں پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

جونؔ کے نزدیک بڑے لوگ یعنی وہ لوگ جنہوں نے انسان کے لیے، انسانیت کے لیے، زندگی کے لیے اور دنیا کے لیے کسی نہ کسی شکل میں کچھ نہ کچھ کیا ہو۔ اُن کی موت اُن کی زندگی کا اختتام نہیں ہوتا بلکہ ان کی موت ان کی اصل زِندگی شروع ہوتی ہے کیونکہ ان کے کارنامے رہتی دنیا تک یادگار رہ جاتے ہیں۔ اور ان کا پیغام رہتی دنیا تک یاد رکھا جاتا ہے۔ موت ان کے جسم کو فنا کر دیتی ہے مگر ان کی رُوح کو ختم نہیں کر سکتی۔

انشائیہ "تمہارا شکریہ" میں جونؔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ فرنود کا آخری انشائیہ ہے جو شاید جونؔ کا آخری انشائیہ تھا۔ یہ دسمبر ۲۰۰۲ء کے ڈائجسٹ میں چھپا جبکہ جونؔ نومبر ۲۰۰۲ء میں انتقال کر گئے تھے یعنی یہ انشائیہ جونؔ کا آخری انشائیہ تھا کہ جب ان کو یقین ہو چلا تھا کہ اب وہ مزید زندہ نہیں رہ سکتے۔ سو اِس انشائیے میں جونؔ لکھتے ہیں کہ سوچنے والے لوگ مرتے نہیں ہیں بلکہ اُن کی

سوچ اُن کے مرنے کے بعد بھی دنیا میں زِندہ رہتی ہے اور وہ اپنی سوچ اور اپنے پیغام کی صورت میں لوگوں کے بیچ ان کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔

جونؔ ایلیاء لکھتے ہیں:

> اگر یہ مان لوں کہ جونؔ ایلیا مر گئے تو پھر تمہیں یہ ماننا پڑے گا کہ آج ایک سقراط مر گیا، ہومر مر گیا، تاسیس میلٹی! ہاں، وہ بھی مر گیا۔ ارسطو، وہ بھی ہاں، ہاں۔۔۔! ابنِ مسکویہ ، فارابی ، ابنِ رشد، بو علی سینا، طوسی، خیام ، سعدی ، عرضی، روحی، نطسئے، برٹرینڈ رسل، برنارڈ شا، مل یہ سب مر گئے۔ ایک پوری کی پوری بستی فنا کے گھاٹ اُتر گئی۔ (۱۵)

حوالہ جات

۱۔ ای۔ایم۔جوڑ، "جدید سیاسی نظریے کا تعارف"، مترجم، عبدالصمی، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع دوم، اکتوبر ۱۹۷۱ء، ص ۷

۲۔ جونؔ ایلیاء، "فرنود"، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۶۹۷ء

۳۔ ایضاً، ص ۲۱۴

۴۔ ایضاً، ص ۳۰۰

۵۔ ایضاً، ص ۲۷۵

۶۔ ایضاً، ص ۱۲۷

۷۔ ایضاً، ص ۱۳۷

۸۔ لطیف جاوید، "انسان، فلسفہ اور کائنات"، آکاش، پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۱۶

۹۔ جونؔ ایلیاء، "فرنود"، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ۵۱۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۶۶۹

۱۱۔ قیصر سلام قاضی، "فلسفے کے بنیادی مسائل"، ایس ٹی پرنٹرز، راولپنڈی، طبع ہفتم، ۲۰۱۲ء، ص ۲۰۹

۱۲۔ جونؔ ایلیاء، "فرنود"، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۵۱۲

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۶۶

۱۴۔ گالینا کیرینکو، "لیدیا کورشنووا، فلسفہ کیا ہے"، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۲۸

۱۵۔ جونؔ ایلیاء، "فرنود"، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۶۷

باب چہارم :

"تاریخی موضوعات"

تمام معاشرتی اور سماجی علوم میں "تاریخ نویسی" کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کے ذریعے نہ صرف معاشرے کو وسعت نظری اور وسعت قلبی عطا کیا جاتا ہے مل کر ان میں محنت اور تگ و دو کا جذبہ بھی پیدا کیا جاتا ہے۔ افراد معاشرہ اپنے ماضی کے متعلق جانتے ہیں تو ان میں برے ماضی کی وجہ سے عبرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جب کہ عالی شان ماضی پر فخر محسوس ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں ان کے اندر وسعتِ قلبی اور وسعتِ نظر کے ساتھ ساتھ محنت کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے جو ان کے لیے تعمیر و ترقی کی نئی راہیں کھولتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب "تاریخ کے بدلتے نظریات" تاریخ کے حوالے سے کچھ یوں رقمطراز ہیں:

> تاریخ وہ علم ہے کہ جس میں تہذیب اپنے ماضی کو بیان کرتی ہے یا تاریخ مرحلہ وار انسانی ذہن و شعوری ترقی کو واضع کرتی ہے اور انسانی تجربات کو بتاتی ہے۔ (۱)

مسلمان قوم کا ماضی عروج و زوال سے بھرا پڑا ہے۔ اگر تاریخِ اسلام کا اجمالی جائزہ لیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مسلمان جب ترقی پر آئے تو اوجِ ثریا ہر متمکن رہے اور جب پستی کا سفر شروع کیا تو پھر امہ تحت الثریٰ سے بھی نیچے جا کر دم لیا۔ عروج و زوال اور کامیابیوں اور ناکامیوں کی یہ طویل داستان، موجودہ نسل کے لیے کہیں تو باعثِ فخر ہے اور کہیں باعثِ عبرت۔

ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

> تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے کہ کیونکہ اس کی مدد سے ہم ان روایات سے واقف ہوتے ہیں کہ جو ماضی میں تھیں، دوسری جانب یہ ہمیں اپنے زمانے کی تبدیلیوں سے آگہی دیتا ہے۔ ہمارے نزدیک تاریخ کا مقصد معاشرے میں شعور کو پیدا کرنا، اور اس کے ذریعہ تبدیلی لانا ہے۔ (۲)

جونؔ کے انشائیوں میں جہاں جہاں تاریخ کا ذکر ہوا وہاں وہ ایک تاریخ نگار کی حیثیت سے سامنے نہیں آتے بل کہ تاریخ خاص کر اسلامی تاریخ کے ایک نقاد کے طور پر سامنے آتے ہیں وہ ماضی اور حال کا تقابل

کرتے ہیں اور پھر نتائج نکال کر ان پر تجزیہ کرتے ہیں یا پھر تقابل کیے بغیر ان حالات و واقعات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔

تاریخ اپنے اندر بہت سارے واقعات سمیٹے ہوئے ہیں اور تاریخ لکھنے کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ آنے والے لوگ گزرے ہوئے لوگوں کے حالات سے آگاہ رہیں۔ اپنے ماضی کو یاد رکھے اور اپنے مستقبل کو بہترین بنائے۔ تاریخ سے سبق سیکھنا انسان کی اپنی ذمہ داری ہے اور اسے اس ذمہ داری کو فراموش نہیں کرنا چاہیے مگر اہلِ پاکستان کی یہ بد قسمتی ہے کہ ہم نے اپنی تاریخ سے سبق نہیں سیکھا۔ ہمارا ماضی اِس بات کا گواہ ہے بل کہ مجموعی طور پر تاریخ عالم اِس بات کی گواہ ہے کہ جو قومیں اپنے مسائل کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتی، اپنے اصلی مسائل کو پسِ پشت ڈال کر ضروری مسائل میں اُلجھ جاتی ہے وہ زندگی کے میدان میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ دوسری اقوام کی تاریخ کو اَب ہم ایک طرف رکھتے ہوئے صرف اسلامی تاریخ پر ہی غور کریں تو ہمیں بہت سارے خاندانوں کی، حکومتوں کے عروج و زوال کی ایک طویل داستان نظر آئے گی۔ بغداد تباہ ہو گیا، عثمانیہ سلطنت مٹ گئی اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ یہ سب کیوں ہوا؛ اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ اس دور کے حکمرانوں اور عوام نے اپنے اصلی مسائل کو فراموش کرتے ہوئے زرعی مسائل کو اہمیت دینا شروع کر دی اور پھر تاریخ کی آنکھوں نے وہ منظر بھی محفوظ کیا ہوا ہے کہ جب ہلاکو خان کی فوجیں بغداد میں داخل ہوتی ہے تو اہلِ بغداد یہ طے کرنے میں لگے ہوتے ہیں کہ اصحابِ کیف کے کتے کا رنگ کیا تھا۔

انشائیہ "خاکے" میں جونؔ نے پاکستانی قوم کے اِسی المیے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہم نے معاشرے کے اصلی مسائل کو ایک طرف رکھا وہا ہے۔ زمانے کے چیلنجز کو نظر انداز کیا ہوا ہے۔ اور بامقصد اور غیر ضروری بحثوں میں اس قدر الجھ گئے ہیں کہ ہم زمانے کے ساتھ آگے بڑھنے کے بجائے دن بدن تنزلی کا شکار ہوتے چلے جارہے ہیں۔ ہم زندگی اور مستقبل کے بارے میں کوئی سنجیدہ نظریہ نہیں رکھتے جس کی وجہ سے ہم من الحیث القوم تباہی کی طرف گامزن ہے کیونکہ قوموں کی ترقی اور عروج ہمیشہ ان کی سنجیدگی اور خلوص کا مرہونِ منت ہوتا ہے مگر بد قسمتی سے ہم حسن الحیث القوم زندگی کے اِن دونوں اعلیٰ وارفع مقاصد سے ناآشنا بے گانہ ہے۔ اسی وجہ سے ہم اپنی منزل سے کوسوں دور ہیں اور بدلتے وقت کے تقاضوں کو پورا نہیں کر پارہے۔

تاریخ کا انسانی زِندگی میں بہت اہم مقام ہے۔ انسان تاریخ کو سامنے رکھ کر ہی آگے بڑھتا ہے۔ ماضی اچھا ہو تو اُسے عزم اور اگر بڑا ہو تو اُس سے عبرت پکڑتے ہوئے اپنی اگلی زِندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا

ہے۔ اہلِ برصغیر خصوصاً مسلمانانِ برصغیر کا ماضی شاندار اور تابناک رہا ہے لیکن تاریخ کے صفحات پر وہ اور بھی روزِ روشن کی طرح واضح نظر آتا ہے کہ جب مسلمانوں نے اپنے ماضی سے عزم عبرت حاصل کرنا چھوڑ دیا تو نتیجہ اُن کی حکومت کے خاتمے کی صورت میں آیا انشائیہ "بے شکی" ہیں۔ جونؔ برصغیر کی تاریخ کے اُس اہم واقع کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ جب بہادر شاہ ظفر ہر طرف سے مایوس ہو کر مقابلے سے ہاتھ دھو بیٹھے اور ایسے ہمت ہاری کہ جب جنرل بخت خاں نے لڑنے کی اور فتح حاصل کرنے کی یقین دہانی کرائی تو بجائے اُس کے ساتھ دینے کے بہادر شاہ نے اُسے دُعائیں دے کر رخصت کر دیا۔

اسی طرح جونؔ اپنے انشائیے "میزانیہ" میں بھی اِس بات کا شکوہ کرتے ہیں کہ انسان نے تاریخ سے کچھ سبق نہیں سیکھا۔ اِسی وجہ سے اس نے ہمیشہ نقصان اُٹھایا۔ اور ہمیشہ ایسے انسان کو عزت دی جو کسی بھی طرح سے عزت کے قابل نہیں تھا۔ ماضی میں بھی انسان نے یہی غلطیاں کیں اور ایسے لوگوں پر بھروسا کیا جو کسی بھی طرح سے بھروسے کے قابل نہیں تھے اور ایسے لوگوں کو اپنا مسیحا سمجھا جو کہ سب سے بڑے لٹیرے تھے۔ اس لیے اس قوم کو سنبھل جانا چاہیے اور جو غلطیاں اس نے تاریخ میں کیں تھیں انہیں نہیں دہرانا چاہیے کیونکہ ماضی میں بھی یہی غلطیاں ان کی تباہی کی وجہ بنی تھیں۔ اور اَب کبھی وہی غلطیاں ان کو تباہی کے دہانے پر لا رہی ہے۔ اس لیے جونؔ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے وہ وقت آجائے کہ جب ان کے ہاتھ کچھ نہ رہے اور ماضی کی طرح سب نیست و نابود ہو جائیں۔ اب سنبھل جانا چاہیے اور اپنی غلطیوں کا حساب لگا کر ان کو دہرانے کی بجائے اِن سے سبق سیکھنا چاہیے۔

جونؔ قوموں کے عروج و زوال کو نہایت خوبصورت انداز سے بیان کرتے ہیں اور یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ دنیا میں وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جو تاریخ کو اپنا رہنما بناتی ہے اور ماضی کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے اس سے سبق سیکھتی ہے کیونکہ اگر تاریخ دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے ایسی سلطین گزری جو اپنے زمانے میں بے حد زور آور تھیں اور جنہوں نے عروج کا سب سے بلند مرتبہ پایا لیکن ان قوموں نے اپنے اچھے اور بُرے پر کبھی دھیان نہیں دیا اور بہت سے ایسے افعال سرانجام دیے جو فطرت کے خلاف تھے اور پھر یہی کام اِن کے زوال کا سبب ہے لیکن اِن کے بعد آنے والی سلطنتوں نے اپنے ماضی سے کچھ نہیں سیکھا اور اپنے سے پہلے والی سلطنتوں کے زوال اور کمال سے کچھ سبق حاصل نہیں کیا اور پھر وہ بھی اِسی طرح زوال کا شکار ہوئیں جس طرح ان سے پہلے کی قومیں ہوئی تھی۔

اِس لیے جونؔ کہتے ہیں کہ جو قومیں تاریخ کا شعور رکھتی ہیں وہی کامیاب ہوتی ہیں۔ تاریخ کو جاننا انسان کے لیے از حد ضروری ہے۔ انسان جب تک تاریخ کے اتار چڑھاؤ سے واقف نہیں ہوتا، گزرے زمانے میں دنیا میں جو کچھ وقوع پذیر ہو چکا ہے اس سے آگاہ نہیں ہوتا وہ ترقی نہیں کر سکتا کیونکہ تاریخ کے شعور کے بغیر انسان ماضی کے جبر سے ناواقف رہتا ہے۔ وہ وہی باتیں دہراتا ہے جو کہ تاریخ میں گزر چکی ہیں اور جو صرف تباہی و بربادی کا پیش خیمہ بنی۔ اِسی لیے تاریخ سے آگاہی بہت ضروری ہے تب ہی اِس ظلم و جبر سے نجات حاصل ہوتی کیونکہ آج بھی صاحبِ اِقتدار ماضی کی طرح صرف دولت کی طاقت کو اہمیت دیتے ہیں اور دانش و عقل کی فضیلت کو یکسر بھلا چکے ہیں۔ ماضی میں بھی قومیں اِسی رویے کی بدولت ہی تباہ ہوئیں۔

علم ایک ایسی دولت ہے جس کی بنیاد پر انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا گیا اور اِسی کی بدولت انسان ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔ اس لیے جونؔ کہتے ہیں کہ جو قومیں اس کو اپناتی ہیں وہی ترقی کی منازل طے کرتی ہے اور جو اس سے رشتہ توڑتی ہے وہ اس دنیا میں ذلیل و خوار ہو کر رہ جاتی ہے۔ کیونکہ اگر تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں نے اِس علم کی بناء پر ترقی کی تھی یہاں تک کہ ان کی تہذیب کو دوسری قوموں کی تہذیب پر برتری حاصل تھی۔ اور ہر لحاظ سے انہیں دوسری قوموں پر برتری حاصل تھی لیکن جب انہوں نے اس علم سے رشتہ توڑا تو پھر وہ زوال سے دوچار ہوئی۔ آج اِسی علم کو مغرب اپنائے ہوئے ہے اور اس کی بدولت وہ ساری دنیا پر چھائے ہوئے ہے اور ترقی کی منازل طے کر رہے ہیں۔ انشائیہ "مشرق یار گیا" میں جونؔ اسی حوالے سے بات کرتے ہیں کہ علم کی بدولت ہی مشرق نے تمدنی اور تہذیبی برتری کے دو عہد گزارے ہیں لیکن جب اس نے علم سے بے سروکار اختیار کی تو پھر یہی مشرق شکستہ سے دوچار ہوا۔ اس طرح جس نے بھی اِس علم کو اپنایا وہ دوسروں پر سبقت لے گیا اور مشرق آج اِسی لیے زوال کا شکار ہے اس نے اپنے ماضی کی کی طرح علم کی فضیلت کو نہیں سمجھا۔

اِسی طرح انشائیہ "تاریخ کا عظیم کارنامہ" میں بھی جونؔ علم و حکمت، دانائی اور فہم و فراست کی اہمیت کو بیان کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ بلاشبہ موجودہ دور علم کی فضیلت کا دور ہے اور دنیا علم و دانش کے کارناموں پر فخر محسوس کرتی ہے لیکن ساتھ ہی اس دور میں کبھی ایسے افراد موجود ہیں جو کہ علم اور انسانی شعور کے خلاف ہیں۔ جس طرح موجودہ دور میں عقل مخالف افراد موجود ہیں بالکل اِسی طرح ماضی میں بھی ایسے افراد موجود تھے جنہوں نے علم دشمنی اور جہالت کی بناء پر بہت سے مفکروں کو ابدی نیند سلا دیا تھا۔ اِن کی عقل، شعور اور دانائی کی سزا انہیں موت کی صورت میں دی گئی جو کہ قابلِ مذمت ہے۔

جونؔ اِسی علم دشمنی کے مفکروں کی سزاؤں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ہم انسانیت کے ان شہدائے علم و فکر کو کسی طرح نہیں بھول سکتے جنہیں علم و شعور کی سزا میں زہ پلایا گیا، سولیوں پر لٹکایا گیا، فصیلوں سے نیچے گرایا گیا اور آگ میں زندہ جھونک دیا گیا۔ تاریخِ انسانی کے نڈر مفکروں اور حکیموں نے ان علمی اور سائنسی فتح مندیوں کی ماضی میں جو قیمت ادا کی ہے اس کی وضاحت ضروری ہے تا کہ جاہل، پس ماندہ اور قدامت خوردہ سماجوں میں علم، آگہی اور انسانی عظمت کر رَجز پڑھنے والے اپنے فرائض کو نہ بھُولیں۔ (۳)

اس لیے جونؔ کہتے ہیں کہ ماضی میں تو عقل فی لف لوگوں نے مفکروں کو سزائیں دیں لیکن موجودہ دو عقل دشمنی کے لیے قطعاًناساز گار ہے۔ کیونکہ یہ صرف علم کی دنیا ہے اور اس دنیا میں صرف علم کی بدولت ہی قومیں ترقی کر رہی ہے اِس لیے وہ قومیں یا افراد جو قدیم سوچ کے ساتھ اِس دنیا میں سانس لے رہے ہیں انہیں وقت کے ساتھ چلنا ہو گا اور شعور حاصل کرنا ہو گا کیونکہ صرف وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جو علم، شعور اور دانائی کو اپناتی ہے۔ اور اگر وہ اِس نہیں کریں گے تو وہ ترقی کی دوڑ میں سب سے پیچھے رہ جائیں گے۔

انسان اور حیوان کے مابین جو بنیادی فرق ہے وہ دانائی و دانش کا ہے۔ انسان علم اور شعور رکھتا ہے اور اسی علم کی بنا پر ہی اسے تمام مخلوقات پر فضیلت حاصل ہے۔ لیکن انسان کی یہی دانائی اس کے اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوئی کیونکہ انسان نے اسی دانائی کا استعمال کرتے ہوئے دوسرے انسانوں کا خون بہایا۔ وحشت و بربریت کی داستانیں رقم ہوئیں۔ اپنی داستانوں میں سے ایک وحشت انگیز داستان چنگیز خان کے متعلق ہے جس نے دہشت اور بربریت کا مظاہرہ کیا کہ دنیا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جونؔ اِس انشائیے "شعور، دانائی اور دانش" میں اس خون ریزی کا ذکر کرتے ہیں کہ انسانوں سے بہتر حیوان ہے جو کم از کم علم و شعور نہیں رکھتے اور نہ ہی وہ اپنے جیسے جانوروں کا خون بہاتے ہیں لیکن جانوروں کے برعکس انسان شعور اور دانائی رکھنے کے باوجود دوسرے انسانوں کی تباہی کا سبب بنتے ہیں۔ اس کی مثال تاریخ میں ملتی ہے کہ جب چنگیز خان نے بہت بڑی تعداد میں لوگوں کا خون بہایا۔ اِس طرح انسان ہی انسان کا دشمن ہے اور ایک دوسرے کے خلاف، ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے لیے مہلک ہتھیار بنائے جا رہے ہیں حالانکہ انسان اس علم کی بدولت ستاروں پر کمندیں ڈالے ہوئے ہیں لیکن یہ اِسی دانائی کے سبب دنیا کو اپنے لیے جہنم بنا رہے ہیں۔

بغداد جو کہ ایتھنز کے بعد علم و دانش کا بڑا مرکز تھا وہ شہر تھا جس نے دنیا کو دانش سکھائی اور جو ایک درخشاں تاریخ رکھتا تھا لیکن اس کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ انشائیہ "زوال بغداد" میں جونؔ بغداد کی شکست اور اس کی تباہی و بربادی کا ذکر کرتے ہیں۔ کہ جب ہلاکو خان نے اس پر حملہ کر کے اس کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا تھا لیکن اس وقت بغداد کے پیچھے ایک پوری تاریخ تھی کیونکہ یہ علم و حکمت کا مرکز رہ چکا تھا اِسی لیے اس کی تباہی شیخ سعدی نے مرثیہ کہا تھا لیکن اب بغداد یعنی عراق کی شکست پر کسی سعدی نے کوئی مرثیہ نہیں کیا کیونکہ اَب یہاں جہالت نے فروغ پایا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جہالت ہمیشہ شکست سے دوچار ہوتی ہے اور اس کے مقابلے میں علم و حکمت ہمیشہ جیت جاتی ہے اِس لے ی اگر اِن کے پاس اِن کے ماضی کی علم و حکمت موجود ہوتی تو یہ کبھی شکست نہیں کھاتے اور تباہی و بربادی ان کا مقدر کبھی نہ بنتی۔ جب ہلاکو خان نے بغداد کو تباہ کیا تب بھی اور آج بھی اِس کے باشندے غفلت میں ڈوبے ہوتے تھے اور یہی غفلت اِن کی شکست کا سبب بنی۔

اِس لیے جونؔ کہتے ہیں کہ موجودہ زمانہ علم، دانش اور جمہوریت کا زمانہ ہے اور جو کوئی علم، دانش اور جمہوریت کو ساتھ لے کر نہیں چلے گا وہ شکست سے دوچار ہو گا کیونکہ تاریخ کی یہ زندہ حقیقت ہے اور جس نے اس حقیقت سے نظریں چرائیں وہ پوری طرح تباہ و برباد ہوا۔ اِس لیے تاریخ میں زندہ رہنے اور مستقبل میں ترقی کرنے اور اپنی حیثیت کو منوانے کے لیے علم و حکمت بہت ضروری ہے۔

جونؔ جہاں علم و حکمت اور دانش کو بیان کرتے ہیں وہیں کاغذ کی اہمیت کو بھی بیان کرتے ہیں۔ اس لیے جونؔ کہتے ہیں کہ حکمت اُس وقت تک قید رہتی ہے جب تک اسے زہن میں رکھا جاتا ہے لیکن جوں ہی اسے کاغذ پر اتار دیا جاتا ہے تو پھر وہ آزاد ہو جاتی ہے اِسی طرح دانش وروں کی دانش اور حکیموں کی حکمت ہم تک تحریر کی صورت میں پہنچی ہے اور حکمت کو تحریری صورت میں ڈھالنے کا سلسلہ خود خدا سے شروع ہوتا ہے جب خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو کوہِ سینا پر پتھر کی دو لوحیں دیں جن پر شریعت اور احکامات تھے اِس طرح نسل در نسل اور عہد بہ عہد مختلف چیزوں پر تحریک کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ کبھی تو مٹی کی لوحیں اِس مقصد کے لیے کام آئیں تو کبھی پتھر کی سلیں تاریخ کا حافظہ بنی اور پھر جب کاغذ بنایا گیا تو یہ تاریخ اِن کاغذوں کی صورت میں ہم تک پہنچی اور اس طرح اِن تحریروں کی بدولت ہم تاریخ سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔

ادیب کسی بھی معاشرے کا نہایت اہم فرد ہوتا ہے۔ جو کہ معاشرے کے اتار چڑھاؤ کو الفاظ کا روپ دے کر اپنے کلام میں بیان کرتا ہے۔ ادیب جو کہ ادب میں ایک خاص اہم مقام رکھتے ہیں اور نہ صرف ادب میں بلکہ معاشرے میں بھی نمایاں مقام رکھتے ہیں کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو ہر ایک کی آواز کو سنتے ہیں، سمجھتے

ہیں اور ان کے دُکھوں کا مداوا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے جونؔ ادب کی تاریخ سے مختلف لکھنے والوں کی مثالیں بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اتنے برس گزرنے کے باوجود تاریخ میں زندہ رکھا گیا ہے کیونکہ ان کی جڑیں زمین میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

تاریخِ اسلام اور سیاست کا گہرا تعلق ہے۔ بدقسمتی سے فی زمانہ سیاست کے معنی و مفہوم کو اس قدر بدل دیا گیا ہے اور اِس قدر غلط بنا دیا گیا ہے کہ سیاست کا نام آتے ہی زہن میں اِس طرح کے خیالات آنا شروع ہو جاتے ہیں کہ جیسے سیاست ایک گالی ہے حلانکہ سیاست ایک حکمتِ عملی ہے جس کے ساتھ کاروبار سیاست اور حکومت خوب صورتی اور عمدگی سے چلایا جاتا ہے اور اسلام جو زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کرتا ہے یہ کیسے ممکن ہو گا کہ وہ اتنے اہم موضوع کو اور زندگی کے اتنے اہم پہلو کو نظر انداز کر دے۔ اسلامی تاریخ میں جتنے مدبر سیاست دان گزرے ہیں شاید ہی کسی قوم کی تاریخ میں گزرے ہو۔

انشائیہ "میدان حشر میں" جونؔ ایلیا نے اسلامی تاریخ میں موجود ان سیاست دانوں اور ان کے بعد آنے والے ملوکیتی دور کے سیاست دانوں کا حوالہ دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کی تاریخ اِس بات کی گواہ ہے کہ سیاست اور مذہب کو الگ الگ رکھ کر سیاسی عقائد کی بنیاد پر کفر اور اسلام کا فیصلہ کبھی نہیں کیا گیا بلکہ کفر اور اسلام کا فیصلہ اسلام کے بنیادی عقائد کو سامنے رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے اور یہ بات اسلامی تاریخ میں روزِ روشن کی طرح عیاں نظر آتی ہے۔

خوارج مسلمانوں کا ایک فرقہ ہے جو کہ ۳۷ھ کو حضرت علی اور حضرت امیر معاویہ کے درمیان ہونے والی جنگ کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔ یہ فرقہ دونوں محابیوں کو غلط اور واجب القتل کہتا تھا اور انہوں نے ہی ان دونوں کو مارنے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ حضرت امیر معاویہ تو بچ گئے لیکن حضرت علی کو شہید کر دیا گیا حلانکہ اس سے پہلے خوارج نے کبھی کسی خلیفہ راشد کے کسی فیصلے سے روگردانی نہیں کی لیکن حضرت علی کے "محکم" کے فیصلے کے خلاف بغاوت کر دی۔

جونؔ اِسی فرقے کے حوالے سے بات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خوارج انسانی تاریخ کا ایک عجیب و غریب گروہ تھا۔ جو بیک وقت بے حد ظالم اور بے حد عادل، بے حد حق پسند اور بے حد باطل بھی تھا۔ دین کے لیے جان دینے والے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ دوسرے مسلمانوں کی عورتوں معصوم بچوں اور بوڑھوں پر ذرا بھی رحم نہیں کھاتے تھے اور ان کے ساتھ بڑی بے رحمی سے پیش آتے تھے اور پھر خوارج رفتہ رفتہ کئی فرقوں مین بٹ گئے لیکن "ایمان" کے بارے میں ان کے تقریباً تمام فرقے یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ دین کے

احکام پر عمل کرنے ایمان کا جزو ہے یعنی ایمان کا تعلق عقیدے سے نہیں بل کہ عقیدے اور عمل دونوں سے ہے۔

جونؔ کہتے ہیں کہ اِن تمام باتوں کے باوجود اِس فرقے کی جو بات اچھی ہے وہ یہ ہے کہ اِن کے ہاں خوارج، غیر خوارج اور مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی۔ عمان میں اباضی خارجیوں کی حکومت اور انہیں کی اکثریت ہے اور کے وہاں ہر مسلک کے لوگ اپنے ملک کی تبلیغ کرنے میں آزاد ہیں۔ اور اِن کے مزاج میں گزشتہ کئی صدیوں سے رفتہ رفتہ تبدیلی آتی چلی گئی اور وہ کچھ کے کچھ ہوتے چلے گئے اور آج اِن کے مزاج میں مشرقی اور مغربی دونوں رنگ ملتے ہیں۔

جونؔ اپنے انشائیے "نسب نامہ" میں عرب اور اسرائیل کی لڑائی کے حوالے سے بات کرتے ہیں کہ یہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے خلاف جنگ کر رہے ہیں حلانکہ اگر اسلامی تاریخ دیکھی جائے تو اس وقت بھی عرب اور اسرائیل والے اس طرح نہیں لڑے تھے جس طرح یہ اَب لڑ رہے ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ کی نسل عرب کہلاتی ہے اور حضرت اسحاقؑ کی اسرائیل کہلائی۔ یعنی دونوں ممالک باشندے اِس نسل سے تعلق رکھتی ہیں اور یہ ایک دوسرے کے ساتھ بہت بُری طرح پیش آرہے ہیں۔ اِن کے درمیان ۱۹۷۳ء میں جنگ شروع ہوتی تھی اور اس جنگ کو شروع کرنے میں اسرائیل کا ہاتھ ہے کیونکہ اس نے عربوں کے حق پر ڈاکہ ڈالا ہے اور عرب اپنے حقوق کے لیے اس کے سامنے آکھڑا ہوا ہے۔ اس طرح اِس جنگ کی وجہ سے اسرائیل ہے اور اس کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کی جانیں گئی۔ اسرائیل جو کہ بہت ہٹ دھرم ہے اور اپنی ضد پر کالم تھا۔ اِس کو بدترین شکست ہوئی اور اس کو بُری طرح دھتکارا گیا۔

جون عرب اور اسرائیل کی لڑائی کے حوالے سے کہتے ہیں:

> آج عرب اور اسرائیل کے لوگوں کے بیچ پھر خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ اتنا خون تو ان کا بیچ کبھی نہیں بہا تھا۔ آسمان کڑک رہے ہیں اور زمین چیخ رہی ہیں۔ کون ہے جو بستیوں میں جا کر گریہ کرے اور گریبان پھاڑ کر چلائے کہ اب اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کے بدن بُری طرح خون میں لت پت ہوئے ہیں۔ لاشیں گرائی جاتی ہیں اور لاشیں اُٹھائی جاتی ہیں۔ کیا تمہارے نسب نامے خون سے لکھے گئے تھے۔ (۴)

تاریخِ اسلام اگرچہ ایک روشن اور زریں تاریک ہے لیکن اس میں المیوں اور حادثوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ وجہ جو بھی رہی ہو لیکن یہ ایک تاریکی حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے جہاں ترقی کرتے ہوئے اوجِ

ثریا کو چھونے کی کوشش کی لیکن وہیں جب انہوں نے تزلزل کی طرف اپنا سفر شروع کیا تو راستے کی تمام رکاوٹیں عبور کرتے ہوئے تحت الثریٰ تک جا پہنچے۔ تاریخ شاید ہے کہ مسلمانوں کے دشمن باہر سے بہت کم آئے ہیں اور انہوں نے خود اپنا نقصان زیادہ کیا ہے۔ ایک مشہور مصری عالم کا قول ہے کہ یہودی اور عیسائی مل کر بھی ہمارا اتنا نقصان نہیں کر سکتے جتنا نقصان ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے خود کو پہنچایا ہے۔ اور یہ بات یقینی طور پر کسی قسم کا مبالغہ نہیں بلکہ ایک واضح سچائی ہے۔ جس کا اندازہ تاریخ کے صفحات سے بڑی آسانی سے ہو سکتا ہے۔ ہم نے مختلف قسم کے تعصبات سامنے رکھتے ہوئے ایک دوسرے کو ہی نقصان پہنچایا ہے۔ نسلی اور لسانی تعصبات تو ایک طرف ہم نے ملکی اور نظریاتی تعصبات کی بنیاد پر ایک دوسرے کو جتنا مارا اور نفرت کیں اور اِس ذریعے سے خود کو نقصان پہنایا۔ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

شیعہ سنی، جھگڑا مسلمانوں کی تاریخ میں تقریباً شروع سے ہی موجود ہے۔ اس جھگڑے نے آہستہ آہستہ اتنی شرت اختیار کر لی کہ اس کی بنیاد پر مسلم دنیا میں اتنی بڑی بڑی سازشیں ہوئیں اور حکومتیں بنتی بگڑتی رہیں کہ جس کا ذکر تاریخ کا ایک انتہائی شرمناک ترین باب ہے۔ بدقسمتی سے شعور بڑھنے کے باوجود ہمارے تعصب اور اس نفرت میں کسی قسم کی کمی آنے کی بجائے مزید اضافہ ہوا ہے۔ مدبر رہنماؤں نے اسے ختم کرنے کی بہت کوشش کی مگر اِسے کماحقہ ختم نہ کر سکی۔ ہاں وقتی طور پر اسے دبا ضرور دیا گیا۔

انشائیہ "درمیاں" میں ۱۹۳۸ء میں ہندوستان میں ہونے والے شِیعہ سنی فساد کا ذکر کرتے ہوئے جونؔ مسلمانوں کے دو نہایت مدبر رہنماؤں کے تدبر کا ذکر کرتے ہیں۔ جن میں سے ایک مولانہ ابوالکھلم آزاد ہیں۔ ان کا تعلق سنی کتبہ فکر سے تھا اور سیاسی لحاظ سے وہ کانگرس میں تھے جبکہ دوسرے قائد اعظم ہیں جن کا تعلق شیعہ مکتبہ فکر سے تھا اور مسلم لیگ کے صدر تھے۔ ان دونوں کو اِن فسادات میں لوگوں نے لقب پر بہت زیادہ ابھارنا چاہا اور کوشش کی کہ وہ اپنے اپنے فرقے کی رہنمائی کریں گے لیکن ان دونوں بزرگوں نے اِن مطالبات کو شدت سے رد کرتے ہوئے انتہائی تدبر کا مظاہرہ کیا اور یوں نتیجتاً یہ فسادات انتہائی مختصر رہیں اور ایک سال کے اندر ہی یہ بھلا دیے گئے۔ جونؔ کہتے ہیں کہ اگر ماضی میں ایسے ہی فکر و تدبر کا مظاہرہ کیا جائے تو مسلمانوں کی تاریخ میں سے بہت سارے تاریک ابواب نکالے جا سکتے تھے اور فی زمانہ جب دوبارہ شیعہ سنی فسادات بہت بُرے طریقے سے سر اٹھا رہے ہیں ان کا بھی خاتمہ کیا جا سکتا ہے اور مزید تباہیوں سے بچا جا سکتا ہے۔

آغازِ وقت میں انسان جنگلوں اور پہاڑوں میں رہا کرتا تھا۔ ہزاروں سال کے عرصے میں جسمانی اور ذہنی ارتقاء میں انسان کو نہ معلوم تاریخ کے اندھیرے غاروں اور جنگلوں سے نکال کر آج کی اِس روشن اور

چمک دار دنیا میں لا کھڑا کیا اور یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان آج جس مقام پر کھڑا ہے کیا یہی اس کی منزل ہے۔ واضح طور پر محسوس ہو رہا ہے کہ یہ انسان کی منزل نہیں بلکہ ایک چھوٹا سا سنگِ میل ہے اور انسان کامیابی اور ترقی کے جس راستے پر چل رہا ہے اس پر آگے اور کوئی سنگِ میل اور کئی منزلیں اس کے انتظار میں ہیں۔ معلوم تاریخ میں انسان نے بہت کچھ کہا۔ چاند پر قدم رکھا، مختلف سیاروں تک پہنچا، سورج کی شعاعوں کو زندگی کے مختلف شعبہ جات میں استعمال کرنے کے قابل بنایا اور آج اس مقام پر پہنچا ہوا ہے کہ وہ بڑے بڑے کام جو ہزاروں سال پہلے کا انسان شاید سوچ بھی نہیں سکتا تھا، آج کا انسان نہ صرف کر رہا ہے بلکہ ایک بٹن دبانے کے ذریعے سیکنڈوں کے ذریعے کر دیا ہے لیکن ایک سوال بھی پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کیا آج کا انسان نہ معلوم تاریخ کے غاروں میں رہنے والے انسان سے زیادہ خوش ہے۔ انشائیہ "اس طویل سفر میں" جونؔ بیسویں صدی کے لوگوں کے سامنے یہی سوال رکھتے ہیں کہ آج ہم ترقی کی جن منازل پر ہیں وہ بجا، مگر اِس ترقی میں انسانی تباہی کے ہتھیار ایجاد کیے گئے جو تباہ کن اسلحہ تیار کیا گیا۔ اُس کے جواز میں ہم کوئی دلیل پیش کر سکتے ہیں کیا یہ تباہ کن اسلحہ ہماری زندگی میں کوئی بہتری لے کر آیا یا آنے والے دور میں کوئی بہتری لے کر آ سکتا ہے؟ اور کیا اس تباہ کن اسلحے سے لیس انسان اُن اندھیری غاروں میں انسان سے بہتر ہے اور خوش و خرم زندگی گزار رہا ہے جس کا سب سے بڑا اسلحہ ایک نیزہ ہوا کرتا تھا۔ جس سے وہ جانوروں سے اپنا دفاع کیا کرتا تھا یا پھر زندہ رہنے کے لیے چھوٹا موٹا شکار کیا کرتے تھے۔

اس حوالے سے جونؔ لکھتے ہیں:

> وہ دانش تاریخ کے یوم القیام میں اپنی کیا جواز پیش کرے گی جس نے اس زمین پر زندگی کو کچھ بھی مشکل، کچھ اور بھی ناساز گار بنا دیا ہے۔ اس تہذیب کو تباہ کن اسلحے کے بجائے اپنے وجود کے جواز میں کوئی معقول دلیل پیش کرنا تھی۔ اور یہ الم ناک حقیقت ہے کہ وہ دلیل ابھی تک پیش نہیں کی جا سکی۔ (۵)

دنیا میں وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جو کوشش اور حرکت و عمل پر یقین رکھتی ہے اور اپنی مدد آپ پر بھروسہ کرتے ہوئے عمل کرتی ہیں۔ اس لیے جونؔ انشائیہ "کارنامہ" میں اِس حوالے سے بات کرتے ہیں کہ امن و امان اور ترقی و خوشحالی کے لیے مل جل کر رہنے میں ہی بھلائی ہے۔ جو قوم ٹکڑوں میں بکھر جاتی ہے وہ آگے نہیں بڑھتی۔ اس لیے تمام ممالک کو باہم مل کر مسائل کا حل تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ہی جونؔ پاکستان کے اس عمل کو سراہتے ہیں کہ اس نے دیگر ممالک کے سربراہوں کو اپنے ملک میں اِس

طرح اکٹھا کیا۔ جس طرح اسلامی تاریخ میں "قریش" نے قبیلوں کو اکٹھا کیا تھا۔ بالکل اسی طرح پاکستان نے بھی مسائل حل کرنے اور نفرتون کو ختم کرنے کے لیے ان ممالک کے سربراہوں کو پاکستان میں اکٹھا کیا۔ مزید کہتے ہیں کہ وہ قومین جنہیں اعلیٰ قیادت حاصل نہیں ہوتی وہ کم زور رہ جاتی ہیں جس کا فائدہ طاقت ور قومین اُٹھاتی ہیں اوراِن کم زور قوموں کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ اِس لیے اِن کم زور قوموں کو اپنے زور بازو پر بھروسہ کرکے اپنے مستقبل کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔

قیام پاکستان سے پہلے کے مشکل دور میں جب انگریز حاکم تھے اور مسلمان محکوم قوم کے طور پر زندگی گزار رہے تھے۔ مسلمان انگریزوں کے ہر ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے اس مشکل حالات میں جو شخصیت مسلمانوں میں قوت و حوصلہ پیدا کرنے کے لیے آگے بڑھی وہ سر سید احمد خان تھے جنہوں نے قوم کے درد کو اپنا درد سمجھا اور اس قوم کو علم کی اہمیت سے روشناس کرایا کیونکہ علم ہی وہ واحد ذریعہ تھا جس کو حاصل کرکے مسلمان اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرسکتے تھے اور پھر مسلمان غفلت سے جاگے اور علم کی اہمیت کو سمجھا اور آخر کار اپنے لیے الگ وطن کا حصول ممکن بنایا اور یہ سب کچھ سر سید احمد خان اور دیگر رہنماؤں کی بدولت ہی ممکن ہوا۔ اِسی لیے جونؔ اپنے انشائیے "میں اور کیا کہہ سکتا ہوں" میں سر سید احمد خان کی پاکستان کے حوالے سے انہی خدمات کو قابل ستائش قرار دے رہے ہیں۔ اور انہیں خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ مشہور شخصیات جو کہ ب تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں ان تمام کی مسلمانوں کے حوالے سے کاوشوں کو سراہتے ہیں۔ جو کہ اپنی جانوں پر کھیل کر تاریخ میں اب بھی زندہ ہیں۔

بیسویں صدی کا آغاز موجودہ نسل کی زندگی میں ایک بہت بڑے واقع کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک بات ضروری ہے کہ یہ بیسویں صدی انسانی تاریخ کی بیسویں صدی نہیں ہے بلکہ حضرت عیسیٰ کے دور کے بعد کی بیسویں صدی سے اس سے پہلے اس کائنات کی زندگی کتنی صدیاں بیتی، تاریخ نہ تو ان کا کوئی تذکرہ رکھتی ہے نہ ہی شمار قطار۔ بس چند اندازے ہیں جو تاریخ نویسوں نے قائم کر رکھے ہیں یا پھر کچھ نظریات ہیں جو سائنس دانوں نے دیے ہوئے ہیں۔

کائنات پر انسانی زندگی کا آغاز کب ہوا اور کیسے ہوا اِس کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ اہلِ مذہب کے مطابق یہ ساری کی ساری کائنات ایک لفظ کُن نتیجہ ے ہ اور اس کے بعد خالقِ کائنات نے حضرت آدمؑ کو تخلیق کرکے اس کرہِ ارض پر بھیج دیا اور یوں اس کائنات پر انسانی زندگی کا آگاز ہوا۔ اس کے مقابلے میں سائنس یہ کہتی ہے کہ لاکھوں سال پہلے ایک دھماکے کے نتیجے میں یہ زمین اور اس جیسے دوسرے سیارے وجود

میں آئیں۔ پھر آہستہ آہستہ زمین پر پانی پیدا ہوا اور پانی سے جانداروں کی زندگی کا آغاز ہوا اور وہ جاندار ارتقاء کرتے کرتے لاکھوں سال گزرنے کے بعد انسان کی شکل میں آیا۔ کچھ حضرات بگ بیگ کو لفظ کُن کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور حضرت آدمؑ کو پہلے انسان کے بجائے پہلے باشعور انسان قرار دیتے ہیں۔

انشائیہ "سب سے بڑی خواہش" میں جونؔ نے تخلیقِ کائنات اور آغازِ زندگی کا سرسری ذکر کرتے ہوئے انسانی تاریخ کی اس بیسویں صدی کے متعلق کچھ خدشات اور بہت ساری نیک خواہشات کا ذکر کیا ہے اور کہتے ہیں کہ اُمید کی جاتی ہے کہ یہ صدی جو آنے والی ہے انسان کے لیے سوچنے اور سمجھنے کا ایک بہترین ماحول فراہم کرے گی اور یہ اُمید کرتے ہیں کہ پاکستان اور اس کے عوام اور ساری دنیا کی عوام کو نیا سال اور نئی صدی راس آئے۔

کسی بھی معاشرے قوم اور ملک کی تاریخ دو طرح سے لکھی جاتی ہے ایک وہ جو کہ اس معاشرے کے طاقت ور، اربابِ اقتدار اور اوپر والے طبقے کے لوگ لکھواتے ہیں اور دوسری جو اس معاشرے کے غیر جانب دار افراد لکھتے ہیں۔ پہلی قسم کی تاریخ ہمیشہ جانبدار ہوتی ہے۔ لازمی بات ہے کہ کسی بھی معاشرے کے بااثر افراد یہ تو ہرگز نہیں لکھوائیں گے کہ ان کے دورِ اثر میں ظلم کی حکمرانی تھی۔ کوئی بھی صاحبِ اقتدار یہ نہیں چاہتا کہ آنے والی نسلیں انہیں ظالم کے طور پر جانیں۔ اور اسے بُرا بھلا کہے۔ سو وقت کے حکمران مورخ کو پیسے دیتے ہیں اور اس سے اپنی مرضی کی تاریخ لکھواتے ہیں۔ یہ تاریخ مکمل طور پر جانبدار ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک متوازی تاریخ وہ بھی چل رہی ہوتی ہے جو اس معاشرے کے غیر جانبدار طبقات لکھ رہے ہوتے ہیں۔ اس تاریخ میں اگرچہ کہیں نہ کہیں مصنف کی ذات کا عمل دخل ضرور ہوتا ہے لیکن مجموعی طور پر یہ تاریخ غیر جانبدار ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے لکھے کا مقصد روپے پیسے یا دولت کا حصول نہیں بلکہ آنے والی نسلوں تک سچائی پہنچانا ہوتا ہے اس لیے یہ تاریخ غیر جانبدار ہوتی ہے۔

اسی طرح کسی بھی ملک یا ریاست کے اپنے مقاصد ہوتے ہیں اور وہ ان مقاصد کے حصول کے لیے ہر طرح سے کام کرتی ہے۔ ان کا نصابِ تعلیم ایسا مرتب کیا جاتا ہے جس کے ذریعے وہ ریاست اپنے مقاصد حاصل کرتی ہیں۔ ذرائع ابلاغ خاص طور پر سرکاری ذرائع ابلاغ سے اِس طرح کا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے جو بالکل ریاستی مقاصد کے عین مطابق ہوتے ہیں اور اسی کے ذریعے وہ اپنے مقاصد کے حصول کو یقینی بناتے ہیں۔

پاکستان سرکاری ذرائع ابلاغ میں مختلف اخباروں کے ساتھ ساتھ ریڈیو پاکستان اور اور پی۔ ٹی۔ وی شامل ہیں۔ پی۔ ٹی۔ وی ہمیشہ سے حکومتِ وقت اور ریاست پاکستان کے مقاصد کے مطابق پروگرام پیش کرتا

ہے۔ بالکل یہی حال ریڈیو پاکستان کا بھی ہے۔ اِن دونوں پر حکومت اور ریاست کے حوالے سے ایسا کوئی پروگرام یا ایسی کوئی خبر نظر نہیں آتی جس کے ذریعے ریاست یا حکومت پر کسی قسم کا حرف آرہا ہو۔ ایک طرح سے یہ دونوں ادارے حکومتی اور ریاستی پروپیگنڈے کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔ اِن پر وہی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں جن کا تعلق ریاست اور حکومت کی اچھائیوں سے ہوتا ہے۔

انشائیہ "ہارون رشید اور ریڈیو پاکستان" میں جونؔ اِسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ در حقیقت ہر ریاست کی طرح ریاست پاکستان کے بھی کچھ مقاصد ہیں۔ اور اِن مقاصد کے حصول کے لیے وہ ہر طرح کا پروپیگنڈہ کرتی ہے۔ اس انشائیے میں جونؔ ریڈیو پاکستان پر نشر کیے گئے ایک ڈرامے "ہارون رشید اور ریڈیو پاکستان" کے حوالے سے ذکر کرتے ہوئے پاکستان میں مختلف تاریخی واقعات کو غلط اور پر پیش کرنے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس ڈرامے میں ہارون رشید کے ہاتھوں برمکی خاندان کی تباہی کا واقعہ ہے۔ برمی خاندان ایک شخص یحییٰ برمی نے ہارون رشید کو خلیفہ بنوانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے اپنی جان خطرے میں ڈالی اور نہ صرف ہارون رشید کی جان بچائی بلکہ اسے خلیفہ بھی بنایا لیکن ہارون رشید نے اس کی محبت اور خلوص کا یہ صلہ دیا کہ وہ اپنے جن بیٹوں فضل اور جعفر سے بھی زیادہ ہارون رشید سے پیار کرتا تھا ان کو ہارون رشید نے قتل کروادیا۔ نہ صرف انہیں قتل کروایا بلکہ ان کے پورے خاندان کو تباہ و برباد کر دیا۔

اِس ڈرامے میں کچھ ایسے ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ خاندان باغی تھا اور غلط تھا اور ہارون رشید کا ان کو قتل کروانا بالکل حق بجانب فیصلہ تھا۔ جونؔ کے مطابق یہ تاریخ کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے اور تاریخ کو مسخ کیے جارہا ہے۔ اِسی طرح اور بھی کچھ واقعات کا ذکر کرتے ہیں جو کہ ہماری تاریخ میں اِس غلط انداز سے پیش کیے جاتے ہیں کہ ظالم مظلوم لگتا ہے اور مظلوم ظالم۔ جو درست ہوتا ہے اور حق پر ہوتا ہے وہ جھوٹا اور غلط لگنے لگتا ہے جبکہ جھوٹا اور ناحق آدمی ٹھیک لگنے لگتا ہے جن میں سے ایک قابلِ ذکر واقعہ "شاہنامہ اسلام" کے خالق فردوسی اور محمود غزنوی کا بھی ہے۔ محمود غزنوی نے فردوسی کو شاہنامہ کا بہت زیادہ معاوضہ دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن جب اس نے شاہنامہ لکھ لیا تو محمود غزنوی مکر گیا۔ ہماری تاریخ میں فردوسی کو غلط جبکہ محمود غزنوی کو ایک خدا ترس اور رحم دل قسم کا انسان ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہی حال اورنگ زیب عالمگیر اور داراشکوہ کے ذیل میں بھی ہے کہ داراشکوہ کو ایک انتہائی نااہل قسم کا انسان ثابت کیا جاتا ہے۔

جونؔ کہتے ہیں کہ یہ بات ٹھیک ہے کہ ریاست کو اپنے بیانیے کے حصول کے لیے کچھ ایسے کام کرنے پڑتے ہیں لیکن کالے کو سفید اور سفید کو کالا کرنا ایک انتہائی نامناسب عمل ہے اور ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ایک اچھے انسان کو اچھا ہی ثابت کرتا ہے اور بڑے کو بڑا ہی بیان کرنا چاہیے۔

اس سلسلے میں جونؔ یوں رقمطراز ہیں:

> یہاں تاریخ کو سر کے بل کھڑا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاریخ کا جائزہ لینے اور اس کا مطالعہ کرنے کے دوران ہماری یہ خواہش رہتی ہے کہ ظالم کسی طرح بے قصور اور مظلوم کسی ترکیب سے قصور وار ثابت ہو جائے۔ یہ انداز روز بہ روز عام ہوتا جارہا ہے۔ پاکستان میں عام طور پر جتنی تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں ماہرینِ تاریک نے یہی ہنر دکھایا ہے۔[۶]

تاریخ برصغیر اپنے اندر سینکڑوں المیے سموئے ہوئے ہیں اس کا ایک بڑا سبب بھی ہے کہ یہ علاقہ ہمیشہ سے بیرونی حملہ آوروں کا اماجگاہ رہا ہے۔ آریاؤں سے لے کر انگریزوں تک ہر دور میں باہر سے حملہ آور آتے رہیں۔ اِن علاقوں پر حملہ کرتے رہے، کچھ تو محض لوٹ مار کر کے واپس چلے جاتے تھے مگر کچھ نے یہاں پر باقاعدہ حکومتیں قائم کیں۔ یہ حکومتیں طویل عرصے تک رہیں، کچھ انتہائی مختصر عرصے کے لیے بھی رہیں۔ مگر اکثر ان کا خاتمہ باہر سے آنے والے حملہ آوروں کے ہاتھوں ہی ہوا۔ خاص کر مسلمان خاندانوں کی اکثر حکومتوں کا خاتمہ دوسرے مسلمان حکمرانوں کے ہاتھوں ہی ہوا اور یہی تاریخ کے بہت بڑے المیے ہیں۔

جون ۲۰۰۵ء اور جولائی ۲۰۰۵ء کے سینس ڈائجسٹ میں چھپنے والے دو انشائیوں "مخول-۱" اور "مخول-۲" میں جون ایلیا نے برصغیر کی تاریخ انہی المیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ "مخول-۲" میں اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھوں ایک مشہور صوفی بزرگ اور منصور حلاج کے مقلد شیخ سرمد کی موت کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ شیخ سرمر بھی شفیع منصور حلاج کی طرف سے فلسفہ وحدت الوجود کے ماننے والے تھے اور انہوں نے بھی شیخ منصور حلاج کی طرح زلحق کا نعرہ لگایا تھا جس کی پاداش میں انہیں پھانسی دے دی گئی تھی۔ جونؔ اِس انشائیے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے معاشرے اور سماج میں سچ بولنے والے کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے۔

جونؔ انشائیے "مخول-۱" میں انگریز دورِ حکومت میں مسلمانوں کی صورتِ حال کا ذکر کرتے ہیں۔ خاص کر ۱۸۵۷ء عدد میں جنگ انگریزوں نے ہندوستان کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو معزول کر کے

جلاوطن کر دیا اور ہندوستان کا تخت با اقاعدہ طور پر سنبھال لیا کو بہت بڑا المیہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس انشائیے کے آخر کے میں بھی جونؔ شیخ منصور کا ذکر کرتے ہیں، لیکن وہ ذکر صراحتاً نہیں بلکہ کنایتاً کرتے ہیں۔

جونؔ کے انشائیوں کے مطالعے سے جو ایک چیز نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں وہ ان کا تاریخی اور سماجی شعور ہے۔ تاریخ پر جونؔ کی نظر سرسری نہیں بلکہ تفصیلی ہے۔ انہوں نے اسلامی تاریخ کے ساتھ ساتھ انسانی تاریخ کے ہر گوشے میں جھانک کر اسے ہر زاویے سے دیکھا ہے اور تنقیدی انداز میں اس کا جائزہ لیا ہے۔ اس بات کا ثبوت جونؔ بہت سارے انشائیوں میں ملتا ہے۔ جہاں وہ سماج کے حوالے سے، فلسفے کے حوالے سے انسانی نفسیات کے حوالے سے، سیاست اور عالمی سیاست کے حوالے سے یا پھر براہِ راست تاریخ کے حوالے سے بات کرتے ہوئے انسانی تاریخ کا ایک ایسا خوب صورت جائزہ پیش کرتے ہیں جو کہ بہت سارے مورخین کے ہاں بھی کم نظر آتا ہے۔

"تہذیب" کے عنوان سے جونؔ کے بالترتیب چھ انشائیے عالمی ڈائجسٹ میں شائع ہوئے۔ یہ تمام انشائیے عہدِ قدیم سے لے کر مغل دورِ حکومت تک کی ہندوستانی تاریخ پر مبنی ہیں۔ پہلا انشائیہ محض تمہید کے طور پر سامنے آتا ہے جب کہ دوسرے انشائیے میں وہ نامعلوم تاریخ سے لے کر ہڑپہ، موہنجوداڑو اور ٹیکسلا کا ذکر کرتے ہوئے انگریزوں کے دورِ حکومت تک آتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ انشائیے تاریخ کا ایک اجمالی جائزہ ہیں نہ کہ تاریخ کی کوئی تفصیلی کتاب اِس وجہ سے اِن میں تفصیل یا کسی قسم کی کوئی ترتیب بہت کم نظر آتی ہے۔ اِسی طرح قدیم ہندوستان میں لکھی گئی کتابیں "مہابھارت" اور "رامائن" کا تذکرہ کرتے ہوئے کرشن، رام، گوتم بدھ چندا گیت موریا وغیرہ کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ اِسی طرح برصغیر کے تاریخ میں سندھ، پنجاب اور بلوچستان وغیرہ کی شمولیت کا ذکر بھی کرتے ہیں۔

اِن انشائیوں میں جونؔ صرف برصغیر تک محدود نہیں رہتے بلکہ پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے مسلم تاریک کی طرف آتے ہیں اور محمد بن قاسم کے ہاتھوں راجہ داہر کی شکست کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ بنو عباس اور سندھ میں اسماعیلی مکتبہ فکر کے لوگوں کی حکومت کا بھی سرسری طور پر ذکر کرتے ہیں۔ جنہیں مٹانے کی سر توڑ کوشش کی گئی۔ واضح رہے کہ جونؔ ایلیا کا جھکاؤ اسماعیلیت کی طرف اس قدر تھا کہ بعض لوگوں کے بقول وہ تھے بھی اسماعیلی، لیکن آباؤاجداد کے اثنا عشری شعیہ ہونے کی وجہ سے انہیں مکمل طور پر اسماعیلی بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہاں ایک عرصہ تک جونؔ نے با قاعدہ اسماعیلی مکتبہء نظر کے لیے اور ان کے دفاع میں کتابیں بھی لکھیں۔ سو "تہذیب" کے عنوان سے چھٹے انشائیے میں وہ ایک بار پھر اسماعیلوں کا ذکر کرتے

ہوئے ان کی روشن خیالی اور ذہانت کا تذکرہ کرتے ہیں اور محمود غزنوی کے ہاتھوں ان کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے شیر شاہ سوری اور خوشحال خان خٹک تک آتے ہیں اور ان کی آپس کی جنگ کا ذکر کرتے ہوئے مغل بادشاہ جہاں کے بیٹیوں کی آپس کی جنگ کا ذکر بھی کرتے ہیں۔

علمی وادبی موضوعات:

ادب کا مطلب آرٹ، سلیقہ اور زندگی گزارنے کا طریقہ ہے۔ ادب ایک لطیف فن کا نام ہے اور اس فن کا موضوع زندگی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ادب زندگی کے مختلف موضوعات وحوادث سے اپنا مواد حاصل کرتا ہے۔ اس اعتماد سے ادب اور زندگی کا رشتہ بہت بڑا گہرا اور واضح ہے۔ ادب زندگی کے داخلی اور خارجی حقائق، جذبات، کیفیات، احساسات وواردے کا اظہار بھی ہے اور ترجمانی بھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ادب تنقید حیات بھی ہے۔ اس کی بنیاد احساس پر ہے ادیب الفاظ اور زبان کے وسیلے سے اپنے احساسات کا اظہار لفظوں میں کرتا ہے۔

ادب کے حوالے سے ڈاکٹر مسلم انصاری لکھتے ہیں:

> ادب زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ادب کے بہت سے پیرائے ایسے ہیں جو زندگی کو براہِ راست بیان نہیں کرتے۔ لیکن علامت واستعارے اور تمثیل کے پیرائے میں بھی وہ زندگی ہی کو بیان کرتے ہیں۔[۷]

ادب وہ تحریر ہے جس میں زندگی کی خارجی اور داخلی حقائق کی صحیح اور سچی ترجمانی کی گئی ہو اور اس ترجمانی کا انداز اور اسلوب حسین اور خوبصورت ہو۔ یعنی ایک ایسا سٹائل جو اس تحریر کے لیے موزوں الفاظ، تراکیب اور ترتیب سے مجموعی طور پر حسن وخوبصورتی پیدا کرے اور یہ حُسن وخوبصورتی قاری یا سامعین کے ذہن ودل میں ایک آگئیں کیفیت پیدا کردے۔ صرف مسرت ہی نہیں بلکہ غم والم کے لطیف جذبات بھی ابھارے۔

ادب زندگی سے اپنا سرمایہ تخلیق اخذ کرتا ہے کیونکہ ادیب بھی معاشرے کا فرد ہے وہ معاشرے میں ہونے والی مختلف،،سے نہ صرف متاثر ہوتا ہے بلکہ اس کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ ادیب زندگی کی، عوام کی داخلی اور جذباتی تاریخ نگاری کرتا ہے اس کی آنکھ اشیاء کی گہرائی اور کائنات کی وسعتوں تک دیکھ سکتی ہے۔ وہ ایسے ایسے گوشوں اور باریک زاویہء حیات کو اپنے شعر وادب اور فن میں سمو کر پیش کرتا ہے جہاں عام لوگوں اور خواص تک کی رسائی نہیں ہوتی۔ ادب زندگی کی صرف تفسیر وتشریح تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ وہ زندگی

پر تنقید بھی کرتا ہے۔ اس کے اچھے بُرے پہلو پر بھی ہمارے سامنے لاتا ہے۔ معاشرے میں پائے جانے والے عدم توازن پر جب اس کی نظر جاتی ہے تو وہ فن کاری کے ساتھ اس کی بنیادوں تک کو ہلا دیتا ہے۔ وہ عدم مساوات، استحصال، ظلم، زیادتی اور انسان پر ہونے والے جبر و تشدد کا نہ صرف ادراک و احساس کرتا ہے بلکہ اس سے نجات دلانے اور نجات پانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ عوام کو نئے شعور دیتا ہے، نئی اقدار کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

ادب جہاں زندگی کا ترجمان ہوتا ہے وہیں وہ اپنے دور کی تاریخ بھی ہوتا ہے اور اپنے معاشرے کے حالات و واقعات کو بیان کرنے کا انتہائی موثر ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے سے ہم کسی بھی قوم کی عادات و اطوار، اس کے رسم و رواج اور کسی بھی قوم کے عروج و زوال سے آگاہ ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر حسرت کاسنجوی لکھتے ہیں:

> جب بھی کسی قوم کے بارے میں ہم کچھ جاننا چاہتے ہیں تو ہمیں اس قوم کے ادب کو پرکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں ہمیں ان کے ادب میں نمایاں ملتی ہیں۔ ادیب ہمارے معاشرے ہی کا ایک رکن ہوتا ہے۔ وہ معاشرے سے متاثر ہوتا ہے اور معاشرے کو متاثر کرتا بھی ہے۔ ہمارے قومی ادب کی داستان بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ (۸)

جونؔ ایلیا ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے۔ اس لیے جہاں یہ نثری و شعری فنی خوبیوں آشنا تھے وہیں وہ فکری لحاظ سے بھی وسعت رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے انشائیوں میں متنوع قسم کے موضوعات کو بیان کیا ہے اور نہ صرف انہوں نے انشائیوں میں ادب کی اہمیت و افادیت کو بیان کیا ہے بلکہ مختلف لکھاریوں کے مقام پر مرتبے کو بھی بیان کیا ہے۔ اسی طرح بہت سے مقامات پر وہ ایسی باتیں بھی کرتے ہیں جن سے قارئین کے علم میں اضافہ ہوتا ہے اور یوں ذہن کی پرتیں کھلتی ہیں۔ اِسی طرح اردو کی اہمیت اور اس کی ناقدری کے حوالے سے بھی بات کرتے ہیں۔

کوئی بھی زبان کسی درخت کی طرح نہیں اُگتی کہ یکدم اُگی اور یکدم تناور ہو کر لہلہانے لگی۔ بلکہ زبان کی پیدائش اور اس کا ارتقا ایک صدیوں پر محیط عمل ہے۔ اودو زبان کے بارے میں عام طور پر ایسے ہی نظریات پائے جاتے ہیں۔ یعنی اردو زبان کے بارے میں عام طور پر ایسے ہی نظریات پائے جاتے ہیں۔ یعنی اردو کے آغاز کے متعلق جو نظریات ہیں اُن سے کچھ ایسا ہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ زبان مسلمانوں کے ہندوستان

آنے سے یک بہ یک معرضِ وجود میں آئی اور پھر ترقی کرتے کرتے اس حالت تک پہنچ گئی کہ جس میں آج ہے۔

انشائیہ "کہیں کا نہیں" میں جونؔ ایلیا تقریباً اِسی خیال کا اظہار کرتے نظر آرہے ہیں اور ساتھ ہی وہ اِس خیال کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ اردو اور ہندی درحقیقت دوزبانیں نہیں بلکہ یہ ایک ہی زبان تھی جسے انگریزوں نے سازش کر کے دو زبانوں میں تقسیم کر دیا تا کہ مسلم ہندو فساد کو ہوا دینے کے لیے زبان کا سہارا بھی آسانی سے لیا جا سکے۔ ورنہ یہ کوئی دوزبانیں نہیں بلکہ ایک ہی زبان ہے اور وہ ہندوستان کے وزیر اعظم اٹل بیاری واجپائی کو اردو کا ہی ایک شاعر سمجھتے ہیں اور ساتھ اِس کرب کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ تقسیم کے بعد اکثر ادیب اپنی شناخت کے بحران میں مبتلا ہو گئے۔ وہ اپنی حساس طبعیت کی وجہ سے اِس تقسیم کو دل سے قبول بھی نہ کر پائے لیکن تقسیم ایک بہت بڑی حقیقت تھی۔ سو انہیں تسلیم کیے بغیر بھی کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ اپنے حوالے سے بات کرتے ہوئے بھی کہتے ہیں کہ میں پہلے ہندوستان کا تھا لیکن اَب میں کہیں کا نہیں رہا یعنی میری کوئی قومیت نہیں اور میں ساری دُنیا کی قومیت سے تعلق رکھتا ہوں۔

مولوی عبدالحق اردو زبان کے بہت بڑے محسن تھے۔ انہوں نے ساری زندگی اردو کی ترویج و ترقی کے لیے وقف کر دی تھی۔ "ہماری زبان" کے نام سے ایک ہفت روزہ رسالہ بھی جاری کیا۔ اور یوں اردوں کی ترویج و ترقی کے لیے جو کچھ کیا جا سکتا تھا وہ مولوی عبدالحق نے کیا۔ ان کی انہی خدمات کے عوض میں انہیں "بابائے اُردو" کا خطاب دیا گیا۔ انشائیہ "آہ بابائے اُردو" میں جونؔ نے ان کی انہی خدمات کو سراہا ہے اور مولوی عبدالحق کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ انشائیہ بنیادی طور پر اِن کی وفات کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ اِن کے مرنے پر ہر آنکھ اشک بار ہے۔ یہ ایک ایسی شخصیت تھیں جنہوں نے اپنی ساری زندگی اُردو زبان کی خدمت کرنے اور اسے ترقی دینے میں صرف کر دی۔ انہوں نے اپنی شخصی زندگی کا بالکل نظر انداز کر رکھا تھا۔

جونؔ کہتے ہیں کہ علم و فن کے نمائندے صرف دولت و اقدار کی چاپلوسی کو اپنا فرض قرار دیتے تھے لیکن مولوی عبدالحق علم و دانش کی عظمت کو بخوبی سمجھتے تھے۔ اس لیے وہ اربابِ دولت کو اہمیت نہیں دیتے تھے بلکہ ایسے طبقے سے تحقیر آمیز انداز سے پیش آتے تھے۔ اِس کے ساتھ جونؔ یہ بھی بتاتے ہیں کہ مولوی عبدالحق کی سب سے بڑی خواہش اُردو یونی ورسٹی قائم کرنا تھا جو اِن کی زندگی میں قائم نہ ہو سکی اَور اُن کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

جونؔ ایلیا نے انشائیہ "دکن سے ایک خط" میں اُردو زبان کے حوالے سے بات کی ہے اور شمالی ہند اور جنوبی ہند میں اِس زبان کے مستقبل کے بارے میں بیان کیا گیا۔ جونؔ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں آزادی کے سالوں بعد سے ہی اُردو کا مستقبل تاریک ہونا شروع ہو گیا تھا۔ شمال میں صرف بہار وہ علاقہ ہے جہاں اُردو کی حالت کچھ بہتر ہے اَور اس کے چند فعلوں میں اُردو کو ثانوی زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ شمال میں اُردو کے حوالے سے صرف جو بات دل خوش کن ہے وہ یہ ہے کہ وہاں کے اُردو بولنے والے اس زبان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک زبان خیال کرتے ہیں لیکن وہاں جو مشاعرے منعقد کرائے جاتے ہیں ان میں جو شعر پڑھے جاتے ہیں وہ دیوناگری میں ہوتے ہیں اور لکھے بھی اِسی زبان میں جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی یہ نئی نسل عربی دعائیں بھی دیوتاگری میں لکھ کر یاد کرتی ہے۔ یہاں تک کہ غالبؔ وہ شاعر ہیں۔ جو یہاں دیگر زبانوں کے شاعر کی نسبت زیادہ مقبول ہیں اور ان کی شاعری ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہے لیکن یہاں بھی غالبؔ کی وہ شاعری مراد ہے جو کہ دیوتاگری رسم الخط اور لہجہ کی بدولت غالب سے "گالب" کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ اِسی طرح غزل بھی "گجل" ہو کر رہ گئی ہے۔ جو کہ اُردو رسم الخط کا ایک المیہ ہے۔

جونؔ ایلیاء کہتے ہیں:

> شمال میں اُردو صرف بول چال کی زبان بنتی جا رہی ہے اور ہے یوں کہ اُردو اَب بھی سارے ہندوستان کی مشترک بولی ہے۔ پس یہ ہے کہ اسے اُردو کے بجائے ہندی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بہ ہر حال جنوب سے اسے باقاعدہ ایک زبان کی حیثیت حاسل ہے اِس لیے کہ وہاں کے اُردو والوں نے اپنے احساس، تاثر اور غفلیت کی ایک تاریخی حقیقت کو دریافت کر لیا ہے اَور وہ حقیقت ان کے خیال میں یہ ہے کہ یہ سب ہماری مادری زبانیں ہیں اور اُردو ہمارے نفسیاتی، فکری اور اعلیٰ تہذیبی تشخص کی زبان ہے۔[۹]

جنوبی ہند میں اُردو کی صورتِ حال شمال کے مقابلے میں کسی قدر بہتر ہے۔ جونؔ کہتے ہیں کہ یہاں بھی اُردو زبان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک زبان کہا جاتا ہے مگر یہاں کی خاص بات یہ ہے کہ اِس علاقے میں مسلمانوں کی مادری زبان اُردو نہیں ہے بلکہ یہ زبان اختیاری زبان کے طور پر رائج ہے لیکن یہاں کے لوگ اس زبان کو اسم الخط اور اُردو تعلیم کی بنیاد زیادہ مضبوط ہے کیونکہ کئی صدی پہلے "دکن" اُردو کا سب سے بڑا

تخلیقی اور تعلیمی مرکز تھا اور اُردو وہاں کی سرکاری زبان تھی۔ اس کے بعد بھی اُردو یہاں کی سرکاری زبان ہی رہی اور اس کے ساتھ ساتھ علمی اور تعلیمی زبان کی حیثیت سے بھی برقرار رہی اور اب بھی یہ زبان یہاں صرف بول چال کی زبان کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس زبان کو قابلِ ذکر حد تک علمی، تعلیمی اور تخلیقی زبان کی حیثیت حاصل ہے۔

اس کے ساتھ ہی جونؔ اُردو زبان کے حوالے سے کہتے ہیں کہ وہ زبان جو علاء الدین خلجی اور پھر تغلق کے عہد میں دلی سے دکن گئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہاں اُردو نثر اور شاعری کا ظہور ہوا اور دکن شاعری کا پہلا عظیم الشان مرکز قرار پایا۔ پھر اُردو شاعری ولی دکنی کے دیوان کے ذریعے دلی کی گلی کو یوں پھیل گئی اَور پھر سارے شمالی ہند اور وسطی ہند وغیرہ میں اور اب اُردو زبان دوبارہ دکن میں اپنی پرانی بنیادوں کو استوار کر رہی ہے۔

انشائیہ "حیدر آباد دکن سے دوسرا خط" گزشتہ انشائیے سے جڑا ہوا ہے اور اس میں جونؔ جنوبی ہند میں اُردو کے حوالے سے اور خاص طور پر اس کے مختلف علاقوں اُدو کے استعمال اور فروغ کے متعلق بات کرتے ہیں۔ جونؔ ایلیا ان دنوں حیدر آباد دکن میں قیام پذیر تھے اور اُردو زبان کے حوالے سے یہ خط انہوں نے معراج رسول کو لکھے اور ان تمام خطوط میں انہوں نے اُردو کے حوالے سے معلومات پہنچائی ہے کہ کن کن علاقوں میں اُردو کس حد تک بولی اور استعمال کی جاتی ہے۔ جونؔ کہتے ہیں کہ آندھرا پردیش اُردو زبان وادب کا تاریخی مرکز رہا ہے۔ اس کے علاوہ جن علاقوں میں اُردو اپنے رسم الخط میں پوری روانی کے ساتھ لکھی جاتی ہے اِن میں تاصل ناڈو، کرن ٹک اور کیرالا شامل ہیں۔ کرن ٹک میں تو گزشتہ پچیس تیس سال میں اُردو ادیبوں اور افسانہ نگاروں کی بہت بڑی معتبر جماعت دیکھنے کو ملتی ہیں اَور انہوں نے نہ صرف اُردو افسانے بلکہ اُردو شاعری کو بھی بہت خوبصورتی اور پورے سلیقے کے ساتھ سیکھا۔

جونؔ کہتے ہیں کہ اگر تامل ناڈو کا علاقہ دیں تو پرانے دور میں یہاں کی سرکاری زبان فارسی تھی اور اس علاقے میں عربی اور فارسی دونوں زبانیں تصنیف و تالیف کا ذریعہ تھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں میں بھی لکھنے کا سلسلہ جاری تھا لیکن تمام زبانوں کی مربی و ادب سے اِس علاقے کا زیادہ گہرا رہا ہے۔ جہاں تک تامل ناڈو میں اُردو زبان کی بات ہے تو یہاں اُردو مقبول رہی ہیں۔ اور یہاں کے تقریباً دو ہزار سے زائد سرکاری وغیر سرکاری سکول ایسے ہیں جن میں اُردو پڑھائی جاتی ہے۔ اِس کے علاوہ یہاں کے چار اضلاع ایسے ہیں جہاں تقریباً چار سو شاعر فکرِ سخن میں معروف ہیں۔ اس کے ساتھ ہی افسانہ نگار، عالم، نقاد اور محقق بھی اپنے اپنے

شعبوں میں طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ اِسی طرح جنوبی اکادٹ میں دو مدرسے ایسے ہیں جہاں یونی ورسٹی کی سطح پر عربی، فارسی اور اُردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تامل ناڈو میں ہندی زبان سے نفرت کی جاتی ہے جبکہ اُردو زبان کے متعلق یہاں کی بلکہ سرکار کا رویہ نہ مخالفنہ ہے اور نہ ہی ہمدردانہ، لیکن یہاں کی عوام اُردو زبان و ادب سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ تامل ناڈو کے مشہور شاعر، ادیب اور عالم جناب کاوش بدری کی زبانی یہاں کم و بیش بیس لاکھ افراد اُردو اسم الخط استعمال کرتے ہیں۔

یہ انشائیہ جونؔ کے ذاتی رسالے "انشا" کے پہلے شمارے کے لیے لکھا گیا تھا۔ اِس لیے اِس شمارے کے شروع میں جونؔ نے انسانی فکر کے ارتقاء اور تخلیقی عمل پر کافی تفصیل سے بحث کی ہے۔ ساتھ ہی آخر میں فکری جمود کا شکار مذہبی شدت پسند طبقے پر تنقید بھی کی۔ جون اُن دنوں پاکستانی کرنسی نوٹ پر قائد اعظم کی تصویر لگانے کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ جونؔ کے ماطبق یہ لوگ فکری جمود کا شکار ہیں اور فضول قسم کے مسائل پر بحث کرتے ہیں لیکن اصل مسائل کو فراموش کیے ہوئے ہیں۔

اِس کے ساتھ ہی ایک اور انشائیہ بھی تقریباً یہی موضوع لیے ہوئے ہے یا یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا اِسی موضوع کا تسلس ہے یعنی اس کو آگے بڑھاتا نظر آتا ہے۔ جونؔ کہتے ہیں کہ کوئی معاشرہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ اپنے اصحابِ علم و فن اور فکر و شعور رکھنے والے لوگوں کی قدر و منزلت نہ کریں کیونکہ یہی لوگ معاشرے کا سب سے اہم حصہ ہوتے ہیں۔ معاشرے کو صحیح خطوط پر چلاتے ہیں اور اسے اپنی منزل تک لے جاتے ہیں۔ وہ یونان اور قدیم عرب کی مثالوں سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ دونوں قومیں ایک دور میں دنیا پر راج کرتی رہیں اور اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ اِن قوموں نے اپنے اصحابِ علم و فن کی خوب پذیرائی کی۔ انہیں معاشرے میں نمایاں مقام عطا کیا اور انہیں عزت و احترام سے نوازا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قومیں تاریخ میں آج بھی نہ صرف زندہ ہے بلکہ اپنے دور میں بھی بامِ عروج پر تھیں۔ اس کے مقابلے میں اہلِ پاکستان اور مجموعی طور پر اہلِ اسلام ایک مدت تک اہلِ دانش سے بُرا سلوک کرنے کی وجہ سے اپنا عروج کھوتے رہے ار گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے رہے اور اگر یہی حال رہا تو یہ ذلت و پستی بڑھے گی کم نہیں ہو گی۔

ادیب فطری طور پر معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے وہ معاشرے کو جس نظر سے دیکھ رہا ہوتا ہے یا جیسا دیکھنا چاہتا ہے وہ معاشرے کی مثالی شکل ہوتی ہے۔ یعنی ایک ادیب کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ معاشرے میں شدت پسندی اور تعصب نہ ہو۔ ہر شخص پیار اور محبت سے رہے۔ سرحدیں اس کے نزدیک قید

ہوتی ہے جو انسانوں کو تقسیم کرتی ہیں۔ انہیں اپنے ہم جنسوں سے جدا کرتی ہیں اور اس کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ کاش یہ سرحد نہ ہوتی اور انسان پوری دنیا میں بغیر کسی روک ٹوک کے آزادانہ گھوم پھر سکتا۔

جونؔ چونکہ ہندوستان کے شہر امروہہ سے ہجرت کر کے پاکستان کے شہر کراچی آئے تھے اِس لئے اُن کے ہاں یہ کرب باقی شعراء اور ادیبوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی نظر آتا ہے۔ ان کے گھرانے کی ایک غالب اکثریت امروہہ میں ہی رہ گئی اور پاکستان نہ آسکی۔ اس کے علاوہ ان کے آباؤ اجداد کی ساری قبریں بھی ہندوستان میں ہی تھیں۔ لیکن پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات اُن کے وہاں کت آزادانہ جانے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ تھے اور اس بات کا وہ اکثر ذکر کرتے نظر آتے ہیں۔

انشائیہ "سفر انہ" میں جونؔ لاہور کے سفر کا احوال تحریر کرتے ہوئے اِسی امر کی طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش کرتے ہیں مگر ساتھ ہی اِس بات کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ وہ جو سوچ رہے ہیں وہ محض ایک خواب ہے جو مکمل ہوتا ہر گز نظر نہیں آتا کیونکہ اگر فرض کر لیا جائے کہ ایک ملک اپنی سرحدیں ختم کرنے کے لیے بھی ہو جاتا ہے تو کیا دوسرا ملک اس کام کے لیے تیار ہو گا۔ یہ انشائیہ ایک ادبی سفر کی رُوداد ہے جس میں انہوں نے پنجاب کے مختلف شعرا کا بھی تذکرہ کیا جن سے وہ اِس سفر کے دوران ملیں۔

نفسیاتی موضوعات:

نفسیات کا آغاز علمِ روح کی حیثیت سے ہوا تھا اور اب یہ علم طبعی سائنس کی خالص تجرباتی شاخ کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ نفسیات کا طویل ارتقائی سفر اِس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ مختلف وقتوں میں ماہرین اس کی مختلف انداز میں تعریف کرتے رہے ہین۔ Physcologyدو لفظوں کا مرکب ہے۔ Phsycoاور logy۔ یونانی زبان میں سائیکی کا مطلب روح، نفس اور ذہن وغیرہ کے لیے اور logyعلم حاصل کرنے اور جاننے کو کہتے ہیں۔ یہ ایسا علم ہے جس کے ذریعے انسان کے دماغ اور ذہنی زندگی کی ابتدا اور اس کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی جاتی ہے۔ مختلف مفکرین نفسیات کی تعریف اپنے اپنے انداز سے کرتے ہیں۔ ارسطو نے نفسیات کو تمام ذی حیات چیزوں کو زندگی کا اُصول قرار دیا ہے بلاشبہ ذہن ہی انسان کو اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کیے ہوئے ہے۔ ذہن ایک وحدت ہے۔ حافظہ، فکر اور تخیل تمام ذہن ہی کی کیفیتیں ہیں۔ اس طرح نفسیات ایک ایسی سائنس (علم) ہے جس کے ذریعے انسان کے احساسات، خیالات، دماغ، ذہن، کردار اور اس سے سرزد ہونے والے مختلف افعال پر بحث کی جاتی ہے۔

ادب اور نفسیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ ادیب، ماہر نفسیات ہوتا ہے بل کہ یہ کہ کسی بھی تخلیقی ادب میں ادیب کی نفسیات اور اس کے معاشرے کی نفسیات کہیں نہ کہیں جھلکتی نظر آتی ہین۔ یہی بات جونؔ ایلیا کے ہاں بھی بہت واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ انہوں نے اپنے انشائیوں میں اپنی نفسیاتی کیفیات اور ہماری معاشرتی نفسیات کو بڑے خوب صورت اور واضح انداز میں بیان کیا ہے، خاص کر ہمارے معاشرتی دوغلا پن، تعصب نفرت اور منافقت جیسے رویوں کو بہت عمدگی سے واضح کیا ہے۔

ان ہی معاشرتی رویوں میں ایک ایسا رویہ بھی موجود ہے جس کے مطابق فرد سمجھتا ہے کہ وہ صحیح اور دوسرے غلط ہوتے ہیں۔ ہر ایک چاہتا ہے کہ دوسرے اپنی زبان سے ویسی باتیں کریں جو وہ چاہتا ہے اور اگر کوئی اس کی منشا کے خلاف بات کرے گا تو نہ صرف وہ بات نا قابلِ برداشت ہو گی بلکہ اس بات کو سمجھنے اور سننے والا بھی کوئی نہیں ہو گا اور یہی ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ ہر ایک صرف وہی سنتا اور سمجھتا ہے جو وہ خود کہتا ہے اور اگر دوسرے لوگ کچھ اچھا بولیں بھی تو ان کی اس گویائی کو کوئی نہیں سنتا۔ جونؔ کے مطابق اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ اِسی لئے کہتے ہیں کہ اسے کوئی نہ سُنیں کیونکہ ہم وہی کچھ کہتے ہیں جس میں اپنا اپنا فائدہ پوشیدہ ہوتا اِس لیے ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ ہم صرف خود کا سنا رہے ہوتے ہیں۔

اِسی طرح جونؔ کہتے ہیں کہ یہاں بولتے سب ہیں لیکن کوئی سننے اور سمجھنے والا نہیں اور اگر کوئی سُن بھی لے تو وہ اس طرح سنتا ہے جیسے کچھ کیا ہی نہ گیا ہو۔ ان تمام باتوں کے باوجود کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ہر حال میں بولتے ہیں اور اپنی آواز دوسروں تک پہنچاتے ہیں چاہے ان کی باتوں کو کوئی سننے والا ہو یا نہ ہو لیکن ایسے لوگ بھی خسارے میں رہتے ہیں کیونکہ یہاں کے لوگوں سے سچ برداشت نہیں ہوتا اور اگر کوئی پورا سچ بولے گا تو اسے مار دیا جائے گا۔ اِس طرح اس سوچ نے پھیلتے پھیلتے پورے سماج کے افراد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور اب ہر ایک کے لیے سچ نا قابلِ برداشت ہو گیا ہے۔ اس لیے ایسی صورت میں سچ بولنے والے نقصان اٹھاتے ہیں اور جھوٹ بولنے والے اعلیٰ مقام پاتے ہیں اور یہی جھوٹ ہر ایک کے اندر پیوست ہو رہا ہے اور اپنی جڑیں مضبوط کر رہا ہے۔ انسان جھوٹ میں زندہ ہے اور جھوٹ میں ہی زندگی گزار رہا ہے۔ اِسی لیے جونؔ کہتے ہیں کہ یہ وہ دور ہے جب ہر بات میں جھوٹ شامل ہے۔ کوئی بات بھی دل گہرائی اور پوری سچائی کے ساتھ نہیں کی گئی کیونکہ اس زمانے میں سچی بات کہنے اور سننے میں نقصان ہی نقصان ہے۔ اِسی طرح اس بات کو سراہا جاتا ہے جو جھوٹ میں لپٹی ہوتی ہے اور جھوٹ میں لپٹی بات کہنے والے کو ہنر مند قرار دیا جاتا ہے یعنی کہ ہم نے جھوٹ کو اپنے اندر داخل کر لیا ہے۔ اور یوں ہمارا ہر عمل جھوٹ میں لپٹا ہوتا ہے اِس لیے جب

تک ہم اِس جھوٹ کو اپنے اندر سے باہر نہیں نکالیں گے تب تک سچ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور جب ہم جھوٹ کو نکال پھینکیں گے تب ہم دوسروں کی باتوں کو بھی سنیں گے اور سمجھے گیں۔

انسان پر ایسی کیفیات بھی آتی ہیں جب وہ خود سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔ اپنے وجود کا بوجھ اٹھاتے تھک جاتا ہے اور پھر وہ اِس بحث میں گرفتار ہو جاتا ہے کہ اس کا وجود کہاں ے ہے؟ اور کیا مقام رکھتا ہے۔ اس طرح یہ کیفیت ایک دوسرے سے بیگانگی کا بھی ہوتی ہے کہ جب انسان اپنی ذات میں اس حد تک گرفتار ہو جاتا ہے کہ اسے اپنے گردوپیش کا کوئی ہوش نہیں رہتا۔ فی زمانہ ہمارے معاشرے میں تقریباً یہی صورتِ حال چل رہی ہے ہر شخص اپنی ذات میں گم ہے۔ اُسے اپنے اِرد گرد کی کوئی پرواہ نہیں۔ دائیں بائیں کے انسان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے یہ اُس کے مطمع نظر نہیں کیونکہ اس چیز سے اس کی ذات کا کوئی تعلق نہیں بنتا بلکہ اس کا تعلق دوسروں سے ہے۔

انشائیہ "بے گانگی" میں جونؔ نے انسانی زندگی کے اِسی کرب کو بیان کیا ہے کہ جب انسان پر ایسا وقت آتا ہے تو وہ اپنے ارد گرد کی ہر چیز سے بے گانہ ہو جائے اور اپنی ذات میں اِس قدر گم ہو جائے کہ اُسے اپنے اِرد گرد کا کوئی ہوش نہ رہے تو ایسے عالم میں انسانیت کے ساتھ فن بھی مر جاتا ہے اور فن کار کے اندر فن کی بھی رمق باقی نہیں رہتی۔

جونؔ ایک باشعور آدمی تھے اور چاہتے تھے کہ معاشرے کا ہر شخص باشعور ہو، اور جب وہ معاشرے میں موجود مسائل کو دیکھتے تھے تو اس پر کڑھتے رہتے تھے اور سماج کے ان تمام مسائل کو ختم کرنا چاہتے تھے لیکن وہ ایسا کر نہ سکے۔ اور جب وہ اپنی اس کوشش میں ناکام ہوئے تو ان کے مطابق وہ ناکام اور رائیگاں چلے گئے۔ اس طرح یاسیت پسندی نظر آتی ہے۔

یاسیت پسندی ایک بہت بڑا فلسفہ ہے۔ فلسفیوں اور ادیبوں کا بہت بڑا طبقہ اِس کا شکار ہے۔ یہ ایک انسانی نفسیاتی کیفیت ہے جس میں انسان مردم بیزار ہونے کے ساتھ ساتھ خود سے بھی بیزار ہو جاتا ہے اور اس حد تک چلا جاتا ہے کہ بس اوقات خودکشی تک کی نوبت آجاتی ہے۔ اس کیفیت کا شکار اکثر لوگ انتہائی کم عمری میں خودکشی کر بیٹھے یا کم عمری میں نہ بھی کی تو بھی زیادہ لمبا عرصہ نہ جیئے اور موت کو گلے لگالیا لیکن یاسیت زدہ لوگوں میں کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے خودکشی تو نہ کی لیکن یاسیت کا شکار ضرور رہے۔ جونؔ نے باقاعدہ طور پر تو یاسیت پسندی سے انکار کیا اور کہا کہ وہ یاسیت پسند نہیں ہے لیکن اُن کی تحریروں میں جابجا یاسیت پسندی کا عنصر غالب نظر آتا ے ہ۔ ایسے لگتا ہے جیسے جونؔ ایک بہت بڑے وجودی بحران کا شکار ہیں۔ وہ وجود

کے کرب کا شکار ہیں۔ اپنے ہونے پہ شرمندہ ہیں۔ انشائیہ "سناٹے کی بیٹیاں" میں وہ اِسی کرب سے گزرتے نظر آتے ہیں۔ وہ خود کو تلاش کر رہے یہں۔ اپنے ہونے کی دلیل ڈھونڈ رہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کیا اُن کی زندگی کا کوئی فائدہ ہے؟ کوئی مقصد ہے؟ یا وہ بے مقصد ہی زندگی گزارے چلے جا رہے ہیں اور آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچتے نظر آتے ہیں کہ اُن کا وجود بے مقصد اور غیر ضروری ہے اور اُن کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا جیسا کہ وہ اپنی نظم میں کہتے ہیں۔

کس کو فرصت کہ وہ مجھ سے بحث کرے اور ثابت کرے کہ میرا وجود زندگی کے لیے
ضروری ہے۔ (۱۰)

یہی مضمون ان کے ہاں بہت سارے انشائیوں میں پایا جاتا ہے۔ اُن کا یہ وجود بحران کا کرب اُن کو چین یلنے نہیں دیتا۔ ساتھ ساتھ انہیں اپنے رائیگاں جانے کا بھی دُکھ کھائے جا رہا ہے۔ انہیں اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ ان کی زندگی جیسی ہونی چاہیے تھی ویسی ہر گز نہیں ہے۔ وہ بار بار اپنی رائیگانی کا ماتم کرتے نظر آتے ہیں۔ انہیں اس بات پر افسوس ہے کہ اُن کی زندگی بے مقصد ضائع ہوتی چلی جا رہی ہے وہ اپنی زندگی کے دوزخ میں قید ہے۔ ان کے نزدیک ان کا اندرون ایک بہت بڑا دوزخ ہے۔ ایسی کیفیت میں وہ خود کلامی کرتے ہیں وہ اپنے آپ سے باتیں کرتے ہیں یا پھر انہوں نے کچھ خیالی ہم ذات تراش رکھے ہیں اور اپنے ان خیالی ہم زادون سے گفتگو کر کے اپنے اندر کا سارا کرب باہر نکال دیتے ہیں۔ اپنے ہونے کا ماتم مناتے ہیں اور اپنے وجود پر افسوس کرتے ہیں۔ ایسا در حقیقت ان کے خارجی حالات کی وجہ سے ہے۔ پہلے بھی یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ جونؔ ادیبوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو حد درجہ حساسیت کا شاکر ہیں۔ سو بارہ کے ماحول اثر لینے والے ادیبوں میں جونؔ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

باہر کی ہوا اَب کیسی ہو گی۔ ویسی ہی ہو گی جیسی تھی، جیسی چھوڑ کر ہم اپنے اندر بھاگ آئے تھے، بھاگ آئے تھے یا کھدیڑے گئے تھے یا یوں کہہ لیں ہوا بھی یہی تھای پر ایک بات اور ہے اور وہ یہ ہے کہ باہر کی ہوا کا کیا کہنا، ہاں بھٹی باہر کی ہوا کا بھلا کیا کہنا۔ (۱۱)

جونؔ اپنے انشایئے "محاسبہ" میں افراد میں پیوست ہو چکی ہے۔ جونؔ کہتے ہیں کہ ایک وقت تھا جب تمام انسان مل کر رہتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں شریک ہوتے تھے کیونکہ وہ اس حقیقت سے

آشنا تھے کہ زندگی کی خوبصورتی متحد ہو کر رہنے میں ہے اِس لیے معاشرے کے تمام افراد ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کی بھلائی چاہتے تھے لیکن رفتہ رفتہ اَب یہ وقت آپہنچا ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ وہ صرف اپنے فائدے اور نقصان کے بارے میں سوچتے ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ اس سماج کے تمام افراد ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں اور اگر یہ ایک دوسرے سے رشتہ توڑ کر اور لاتعلق ہو کر رہے تو یہ خود ہی اپنا نقصان کریں گے۔

اس لیے جونؔ کہتے ہیں کہ سماج کے افراد کی سوچ تبدیل ہو چکی ہے۔ ہر فرد یہ سوچتا ہے کہ کن کن طریقوں سے دوسروں کو لوٹا جا سکتا ہے۔ کس طرح دوسروں کو تکلیف دی جا سکتی ہے اور اپنے لیے خوشیاں اکٹھی کی جا سکتی ہے ایسی صورتِ حال میں کسی سے شکوہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ رجحان رفتہ رفتہ بڑھ کر اب اس سماج میں پیوست ہو چکا ہے اور تمام افراد اس سوچ کے حامل ہو چکے ہیں اور جب تمام افراد کا حال یہی ہو گا تو گلہ کرنے کے لیے کوئی نہیں بچے گا۔

جونؔ ایک ادیب تھے فطری طور پر ایک حساس آدمی تھے۔ ان کے ہاں نفسیاتی موضوعات زیادہ تر اس قسم کے ہیں کہ انہوں نے کسی خاص لمحے میں اپنی نفسیاتی کیفیت بیان کی۔ ایسے موضوعات بھی ملتے ہیں جہاں انہوں نے مجموعی طور پر انسانی نفسیات بیان کرنے کی کوششیں کی ہیں لیکن مجموعی طور پر ان کے ہاں ان کی انہی نفسیاتی کیفیات کا ذکر ملتا ہے ان کے ہاں اکثر پاکستانی قومی نفسیات کا تذکرہ ملتا ہے۔ وہ اِس قوم کے نفس شناس تھے اور جس طرح انہوں نے اِس قوم کی نفسیات کو بیان کیا ہے دوسرے ادیبوں کے یاں ایسا کم ہی ملتا ہے۔ پاکستانی عوام من حیثیت القوم پستی کا شکار ہے۔ تنزل کا شکار ہے۔ اور المیہ ہے کہ اسے الٰہی اِس تنزل کا اِس بربادی کا کوئی احساس تک نہیں۔

جون لکھتے ہیں:

میں بہت عجیب ہوں اتنا عجیب کہ بس خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں۔ (۱۲)

ان کے ہاں پاکستانی قوم کی نفسیات کا جس خوبصورتی سے ذکر ملتا ہے وہ انہی کا فاصلہ ہے۔ ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی منافقت، تعصب، نفرت اور دورنگی کا جس طرح انہوں نے پردہ فاش کیا ہے شاید ہی کسی اور شاعر یا ادیب نے کیا ہو۔

انشائیہ "چھٹا دن" اس قوم کی نفسیات پر ایک بھرپور غمانچہ ہے۔ اس کے ذریعے وہ پاکستانی عوام کو شاید خوابِ غفلت سے بیدار کرنا چاہتے ہیں شاید وہ چاہتے ہیں کہ پاکستانی قوم کو اپنے زیاں کا، اپنی بربادی کا اور

تباہی کا احساس ہو اور وہ اپنی غلطی کو پہچانے اور آئندہ کے لیے ایسی غلطیاں نہ دہرائے۔ انشائیہ "چھٹا دن" میں وہ یونان کے فلسفی اور حکیم سقراط کے ایک مریض کی بیماری کی شدت کے پانچ دن کا احوال لکھتے ہوئے یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس مریض کی زندگی کے پانچ دن کا احوال در حقیقت قیام پاکستان سے اب تک کی پاکستانیون کی زندگی کا حال ہے۔ اور جونؔ کہتے ہیں کہ اس مریض کی بیماری کی شدت کے پانچ دن کا احوال ہے۔ مجھے تمہاری زندگی کا چھٹا دن بھی واضح طور پر نظر آرہا ہے۔ جو کہ تمہاری تباہی کا دن ہے اَب بھی اگر تم لوگوں نے ہوش کے ناخن نہ لیے اور سمجھنے کی کوشش نہ کی تو تم تباہ و برباد ہو جائو گے اور پھر تمہارا کہیں کوئی نام و نشان باقی نہیں رہے گا۔ اس لیے ابھی بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔

ایک ادیب کے لیے سب سے ضروری چیز اظہار ہوتے ہیں۔ وہ جو سوچتا ہے اس کا اظہار جو دیکھتا ہے اس کا اظہار، جو سنتا ہے اس کا اظہار۔ وہ کائنات میں موجود ہر بات کو، ہر حادثے کو، ہر سانحے کو اور ہر واقع کو اپنے الفاظ میں بیان کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے سب سے بڑے دُکھ کی بات اس کے اظہار پر پابندی ہے۔ وہ اپنے ہر کرب کو اور ہر خوشی کو اسی طرح اپنے ارد گرد پھیلے ہر کرب اور خوشی کو شعروں، تصویروں اور مختلف ادبی اصناف کے ذریعے بیان کرنا چاہتا ہے اور یہ انسانی بنیادی حق بھی ہے لیکن ایک عام انسان کے لیے یہ اظہار اس قدر ضروری نہیں ہوتا کہ جس قدر ایک سوچنے اور ایک سمجھنے والے اور ایک حساس انسان کے لیے ہوتا ہے۔

انشائیہ "شام کی آوازوں کے ساتھ" میں جونؔ اِس کرب کا اظہار کر رہے ہیں کہ وہ کہنا چاہتے ہیں، وہ اظہار کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے اندر کا کرب لفظوں کی صورت میں لوگوں کے سامنے لانا چاہتے ہیں۔ مگر اظہار پر پابندی ہے۔ وہ جو کہنا چاہتے ہیں وہ کہہ نہیں سکتے۔ وہ اپنے کرب کا اظہار نہیں کر سکتے۔ اس لیے ان کے اندر کی آوازیں مرتی جا رہی ہیں۔

ادب میں مابعد جدیدیت کی بحث عصرِ حاضر کی ایک اہم ادبی بحث ہے۔ انسان اپنے ماضی الضمیر کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ خاص لمحات میں اپنی خاص نفسیاتی کیفیات کو لفظوں کا روپ دینا چاہتا ہے لیکن کیا اس کی نفسیاتی کیفیات کا اظہار ادب سمجھا جائے گا؟ جونؔ کے انشائیوں میں اُس کے اپنے زندر کی یہ بحث بہت زیادہ ملتی ہے۔ اِن کی اکثر انشائیے پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص وقت میں جس ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کا شکار ہیں ہمیں اُس نے اِس کیفیت کو کاغذ پر اُتار دیا ہے۔ انشائیہ "بند دروازے کے سامنے" ایک ایسا ہی انشائیہ ہے جس میں افسانوی عنصر نمایاں ہو کر نظر آرہا ہے۔ جونؔ اِس انشائیے میں ہمارے معاشرے کی ادب کے

حوالے سے سوچ اور ادیب کے ساتھ اُس کے روپ کو بڑے طنزیہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ جعلی ادیبوں کے بارے میں بھی لکھتے ہیں کہ وہ در حقیقت ادیب نہیں ہوتے بلکہ چور ہوتا ہے کیونکہ وہ لوگ خوش قسمتی سے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے ہیں اور عوام کے ایک بڑے طبقے پر اپنے عہدے اور اختیار کے ذریعے اثر انداز ہو رہے ہوتے ہیں۔ سو اُن کو شہرت، ناموری اور عزت مل ہی جاتی ہے۔ در حقیقت وہ بونے لوگ ہوتے ہیں جن کی شہرت، عزت اپنی نہیں بلکہ اس عہدے اور اس مقام و مرتبے کی ہوتی ہے جو کہ ان کے پاس ہوتا ہے۔ اس مقام و مرتبے کے بغیر ان کی کوئی عزت نہیں۔

جونؔ ایک اصلی شاعر تھے اور اصلی نثر نگار تھے۔ ان کے فن اور فکر کے مطابق کے خیال مین ان کو وہ پذیرائی نہ ملی جو ان کا حق بنتی تھی۔ جس چیز پر وہ اکثر سراپا احتجاج رہے۔ یہ انشائیہ بھی در حقیقت ان کی اسی نفسیاتی کیفیت کا اظہار ہے۔ اور وہ اس معاشرے کی اس جعل سازی پر اسے کھڑی کھڑی سنا رہے ہیں۔ لیکن ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ی جعلی لوگ صرف وقتی طور پر ہی فوائد حاصل کر لیتے ہیں جب تک ان کے پاس عہدہ اور اختیار ہوتا ہے جیسے ہی اُن کا عہدہ اور اختیار اُن کے ہاتھ سے جاتا ہے ان کا ادبی مقام و مرتبہ بھی اس کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے اور پھر آنے والا وقت ان کو یاد نہیں کرتا۔

معاشرے کا دکھ ایک حساس انسان کا ذاتی دکھ ہوتا ہے۔ ہر طف بکھری لاشیں، قتل و خونریزی کا گرم بازار، ہر طرف پھیلا دہشت کا سماں ایک حساس انسان کو ایک عجیب طرح کی اذیت اور کرب میں مبتلا کر دیتا ہے کیونکہ وہ خوشی اور غم کو تقسیم نہیں کر سکتا۔ معاشرے کی ہر خوشی اُس کی اپنی ذاتی خوشی ہوتی ہے اور معاشرے کا ہر دُکھ اس کا ذاتی دُکھ ہوتا ہے۔ وہ اپنے ارد گرد پھیلی کائنات کی ہر خوشی کو اِس طرح مناتا ہے جیسے کہ وہ اس کی ذاتی خوشی ہو اور بالکل اسی طرح ہر غم پر بھی اسی طرح ماتم کرتا ہے جس طرح وہ لوگ مناتے ہیں جو اس غم سے براہِ راست منسلک ہوتے ہیں۔ جونؔ کے اکثر انشائیے ایسے حساس انسان کی نفسیاتی کیفیات کا آئینہ دار ہوتے ہیں جو معاشرے میں پھیلی نفرت، تعصب اور انتہا پسندی پر کڑھتا ہے۔

پاکستان عرصہ دراز سے ایک دہشت کی فضا میں جی رہا ہے۔ کچھ حکومتوں نے اپنے وقت کو دوام دینے کے لیے پاکستان میں خاص طور پر دہشت گردی کو فروغ دیا۔ دہشت گردوں کو پالا گیا۔ مذہبی شدت پسندی پیدا کی گئی۔ مذہبی اختلافات کو ہوا دی گئی اور پھر لوگوں کو اِس مقام تک لے آیا گیا کہ انہوں نے ایک دوسرے کے گلے کاٹنے شروع کر دیے اور ایک دوسرے کو مارنا شروع کر دیا۔ جونؔ کا تعلق بھی ایک ایسے ہی

مکتبہ ء فکر سے تھا جو 80 کی دہائی میں ٹارگٹ ہونا شروع ہوا اور پھر اسی تعصب اور نفرت کی بھینٹ جونؔ کے بڑے بھائی رئیس امرو بھی چڑھے اور قتل کر دیے گئے۔ ان سب باتوں نے جونؔ کی حساسیت مین بہت زیادہ اضافہ کر دیا۔

انشائیہ "ایک طور" میں جونؔ انہین حالات کا نوحہ لکھ رہے ہیں۔ ایک اور بات بھی بیان کرنا ضروری ہے کہ جونؔ کراچی میں رہے اور کراچی کو کچھ خاص مقاصد کی تکمیل کے لیے ستر کی رہائی کے بعد سے ہی نسلی، لسانی اور مذہبی تعصبات کا شکار کر دیا گیا تھا۔ چونکہ کراچی میں وہ مہاجرین بھی کافی زیادہ آباد تھے جو انڈیا سے ہجرت کر کے آئے تھے اور اُردو بولنے والے تھے۔ اُن کے دلوں میں نفرت کا زہر بھر گیا۔ اسلحے کے کلچر کو فروغ دیا گیا اور یوں قتل و غارت کا بازار گرم کر کے خون و دہشت کی ایک ایسی فضا پیدا کی گئی کہ جس نے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

جونؔ کراچی میں ہی رہتے تھے اور ان حالات کا اثر انہوں نے کچھ زیادہ ہی قبول کیا۔ ان کی حالت اُن کی ذاتی اور شہر کے حالات نے بہت دگرگوں کر دی تھی۔ انشائیہ "ایک طور" میں اُن کی اسی نفسیاتی کیفیت کا بیان ہے۔

جونؔ لکھتے ہیں:

> مجھے اس شہر کے شہروں کے دُکھ جھیلنے کی نوکری ملی ہے۔ اگر اس نوکری سے میرا دل اچاٹ ہو گا تو میں اپنے آپ کو حرام خور سمجھوں گا۔ یہ نوکری پاکستان اور ہندوستان کی تاریخ نے مجھے بڑی بڑی سفارشوں کے بعد دی ہے۔ (۱۳)

یوں جونؔ نہ صرف اپنی نفسیاتی کیفیت کو بل کہ معاشرے کے افراد کی انفرادی اور مجموعی طور پر پورے معاشرے کی اجتماعی نفسیات کو نہایت خوبصورت طریقے سے اپنے انشائیوں مین بیان کیا ہے۔

مذہبی موضوعات:

مذہب انسانی زندگی میں بنادی حیثیت رکھتا ہے یہ اخلاقیات اور عبادات کا ایک ایسا مجوعہ ہوتا ہے جو ناصرف انسان کو آنے والی ابدی زندگی کو بہتر بنانے میں مدد دیتا ہے بل کہ اس کی دنیاوی زندگی میں بھی بہت زیادہ ممد و معاون ہوتا ہے۔ مذہب کا تعلق صرف عبادات سے نہیں ہوتا بل کہ معاملات اور اخلاقیات کا بھی مذہب سے چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ یہ انسان کو زندگی گزارنے کا طریقہ بتاتا ہے اور ساتھ ہی ایک نصب العین بھی دیتا ہے مگر بد قسمتی سے ہمارے معاشرے میں مذہب کو صرف عبادات سے خاص کر دیا گیا ہے اور

معاملات اور معاشرے سے اسے بالکل الگ رکھا گیا جس کی وجہ سے یہاں معاملات گڑبڑ کا شکار ہیں اور ایسے معاملات ایک حساس انسان اور ایک ادیب کے لیے دکھ کا باعث ہوتے ہیں جن پر وہ قلم اٹھاتا ہے۔

جونؔ کے مذہبی موضوعات پر لکھے گئے انشائیے زیادہ تر ایسے ہی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ جونؔ کا تعلق چوں کہ شعیہ مکتبہ فکر سے تھا جو کہ ہمارے معاشرے میں ایک لحاظ سے مظلوم طبقہ ہے اور اکثر دہشت گردوں اور شدت پسندوں کی ذد میں رہا ہے اس کے علاوہ جونؔ کے بھائی رئیس امروہی بھی اسی شدت پسندی کی بھینٹ چڑھے۔ اس لیے ان کے مذہبی موضوعات پر لکھے گئے انشائیوں میں شدت پسندی سے نفرت بھی بہت زیادہ ملتی ہے۔

اسلام امن کا داعی ہے۔ اسلام ہمیں اتحاد کا درس دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تمام مسلمان ایک ہو کر اسلام کو فروغ دینے اور اسے پھیلانے میں اپنا کردار ادا کریں لیکن ہم مختلف گروہوں میں بٹ گئے ہیں ہم نے خود کو مسلمان سے بڑھ کر سنی اور شعیہ کی حدود میں محدود کر کے رکھ دیا ہے۔ جونؔ ایلیا اِس فرقہ وارانہ تضادات کو اپنے مختلف انشائیوں میں بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پہلا انسان جب پیدا ہوا تھا تو وہ اس تعصب میں گھِرا ہوا نہیں تھا وہ صرف مسلمان تھا لیکن ہم نے خود کو رفتہ رفتہ فرقوں میں بانٹ لیا ہے۔ اور یہ فرقے وقتاً فوقتاً ایک دوسرے کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں اور پھر یہ نفرت ختم ہونے کے بجائے پروان چڑھتی ہے اور یہ ایسی نفرت ہے جس کے سبب لوگوں کا قتل عام کیا جاتا ہے۔

فرقہ واریت آج کی پیداوار نہیں ہے بلکہ یہ تو صدیوں سے موجود ہے اور تب سے ہی یہ فساد برپا کرنے میں مصروف ہے لیکن اب یہ صورتِ حال شدت اختیار کر گئی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اب نفرتوں کے خلاف صرف نفرتیں ہیں۔ اِن تمام صورتِ حال میں بعض لوگ سوچتے ہیں کہ یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے کہ ہم اس کے خلاف آواز بلند کریں بلکہ یہ مذہبی مسئلہ ہے اور یہ مذہبی رہنما ہمارے مسئلوں پر آواز نہیں اٹھاتے اس لیے ہم ان کے مسئلوں پر آواز کیوں اُٹھائیں۔ لیکن ادیب حضرات اِن تمام معاملات سے آنکھیں نہین چرا سکتے کیونکہ یہ حساس طبعیت کے مالک ہوتے ہیں اور یہ ایک مثالی معاشرہ چاہتے ہیں اس لیے یہ اِن تضادات پر بھی قلم اُٹھاتے ہیں کیونکہ اس سے نسلیں برباد ہو جاتی ہیں۔ اس لیے جونؔ کہتے ہیں کہ یہ سوچنے کا مقام ہے کہ ہم کس راستے کی طرف جا رہے ہیں اور اس راستے پر چلنے کا انجام کیا ہو گا۔

اِسی طرح جونؔ کہتے ہیں کہ یہ تعصبات اتنے عروج پر پہنچ چکے ہیں کہ نہ صرف محرم میں بلکہ باقی مہینوں میں بھی یہ فرقے آپس کے اختلافات کی بناء پر ایک دوسرے کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور پھر

ایک تصادم کی فضاء قائم ہو جاتی ہے اور اِن اختلافات کی وجہ سے یہ ایک دوسرے سے کبھی اتحاد نہیں کرتے اور پھر معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ فرقہ وارانہ فسادات اس حد تک بڑھ جاتے ہیں کہ یہ دونوں فرقے ایک دوسرے کی مساجد میں نماز تک ادا نہیں کرتے اور نہ صرف سنی شعیہ بلکہ دیوبندی اور بریلوی بھی اپنی الگ مسجد قائم کیے ہوئے ہے اور ایک دوسرے کی مسجد میں نماز پڑھنی تو ایک طرف اس مسجد کے احاطے میں بھی داخل نہیں ہوتے۔

معاشرے میں ایسے افراد بھی موجود ہوتے ہیں جو فسادات برپا کرنا چاہتے ہیں۔ جو لوگوں کو آپس میں لڑوانا چاہتے ہیں تا کہ معاشرے میں امن و سکون قائم نہ ہو سکے۔ اس لیے یہ لوگوں میں اشتعال پیدا کرنے کے لیے اور اپنے ناپاک عزائم کو پورا کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتے ہیں۔ اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے وہ دیواروں پر مختلف فقرے درج کرتے ہیں جس سے لوگوں میں ایک دوسرے کے فرقے سے متعلق اشتعال پیدا ہوتا ہے۔ وہیں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اِن تضادات کو ختم کرنا چاہتے ہیں اس لیے وہ ایسے نعرے لکھتے ہیں جس سے امن کی خوشگوار فضا قائم ہو کیونکہ یہ افراد فرقہ پرستی کے بتوں کو پاش پاش کر دینا چاہتے ہیں تا کہ کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ کا دشمن نہ ہو۔

اِسی طرح ایک مسلک کے افراد اپنی بات منوانے کے لیے اور اپنے مسلک کو سچا ثابت کرنے کے لیے دوسروں کے ملک کو حقیر جانتے ہیں جبکہ دوسرے ملک کے افراد بھی یہی سوچ رکھتے ہیں اور صرف اپنے ہی مسلک کو صداقت پر مبنی مسلک گردانتے ہیں۔ حالانکہ اِن بحثوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا کیونکہ کوئی بھی اپنے مسلک کو چھوڑ کر دوسرے مسلک پر یقین نہیں رکھتا۔ اس لیے جونؔ کہتے ہیں کہ یہ فرقے ہمارے اپنے بنائے ہوئے ہیں حالانکہ ہم سب ایک ہی خدا کے ماننے والے ہیں لیکن ہم نے خود کو فرقوں میں بانٹ دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی جونؔ مسلم لیگ کی ان کاوشوں کا ذکر بھی کرتے ہیں جو اس نے ان تضادات کو ختم کرنے کے لیے کین۔ مسلم لیگ کی کاوشوں سے تمام مسلک کے افراد میں چند برسوں کے لیے اتحاد قائم ہو گیا جس کو مسلم لیگ کے حامی اور اس کے مخالفین بھی راہتے ہیں۔

جونؔ ایلیاء کے مطابق:

> مسلم لیگ کی کارگزاری کے زیرِ اثر تقریباً گیارہ بارہ برس تک سنی شعیہ اتحاد کی ایک ایسی فضا قائم رہی اور اب یہ دونوں اس انداز سے شانہ بشانہ رہے جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں کم ہی ملے کہ شاید نہ ملے۔[۱۴]

ہمارے ملک میں ایسے علماء اور رہنما بھی موجود ہیں جو مذہب کے نمائندے سمجھے جاتے ہیں۔ یہ فرقہ واریت کو ختم کر کے سب کو ایک لڑی میں پرونا چاہتے ہیں۔ جس کے بعد نہ کوئی سنی رہے اور نہ ہی شیعہ بلکہ سب متحد ہو کر صرف اسلام کے فروغ کے لیے کام کریں۔ جونؔ اپنے انشائیے "زمین پر" میں ایسے ہی رہنماؤں کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے اس فرقہ واریت کو ختم کرنے کے لیے جدوجہد کی۔ اِسی مقصد کے تحت لاہور میں "جمعیت متحدہ اسلامیہ" نے تمام فرقوں کے رہنماؤں کو اکٹھا کیا تا کہ فرقہ واریت کو ختم کیا جاسکے۔ کیونکہ جب انسان پیدا ہوا تھا تو نہ وہ سنی تھا اور نہ ہی شعیہ۔ ہم نے مختلف فرقے قائم کر کے اسلام کو غلط راستے پر ڈالنے میں کوشاں ہیں اور تعصبات کا شکار ہو گئے ہیں۔ اِسی تعصب کو ختم کرنے کے لیے یہ اجتماع منعقد ہوا۔ جس کے سیکرٹری علامہ علماء الدین صدیقی تھے۔ اس جمعیت کے مقاسد میں فرقہ وارانہ تعصبات کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ شرک کا خاتمہ بھی تھا کیونکہ یہ جمعیت صرف روحانی اور مذہبی مقاصد کے لیے قائم کی گئی تھی اس لیے تمام بدعات کا خاتمہ کرنے اور اسلام کی ترقی و ترتیج کے لیے کوششیں کرنا اس کے بنیادی مقاصد میں شامل تھا۔ اِس کے استھ ہی یہ تمام رہنما اخلاقی اقدار کے فروغ کے لیے بھی کوشاں تھے۔ اِن تمام رہنماؤں نے مذہبی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے یہ اجتماع منعقد کرایا تھا اور تمام رہنماؤں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا تھا ۔ اس لیے جمعیت کی ان تمام کاوشوں کو تمام مذہبی رہنماؤں نے سراہا اور نہ صرف مذہبی رہنماؤں نے بلکہ تمام سماجی حلقوں کی جانب سے بھی اِن کی حوصلہ افزائی کی گئی کیونکہ یہ رہنما مذہبی مقاصد کے ساتھ ساتھ ملک کی آزادی، اس کے تحفظ اور بقاء کے لیے بھی کام کر رہے تھے۔

ہمارے معاشرے میں دین کا پرچار کرنے والے اور اس کی تعلیمات کو دوسروں تک پہنچانے والے مذہبی رہنما موجود ہیں۔ جو کہ دین کی تبلیغ کر کے اسلام کو پھیلانے کا باعث بنتے ہیں لیکن جہاں مخلص رہنما نظر آتے ہیں وہیں چند ایسے مفاد پرست رہنما بھی موجود ہوتے ہیں جو مذہب کی آڑ میں اپنا مطلب نکالتے ہیں۔ جو بات اِن کو پسند ہوتی ہے اس کو مذہب کی آڑ لے کر جائز قرار دیتے ہیں اور جو بات ناپسند ہوتی ہے اس کو مذہب کے ساتھ جوڑ کر اس کی فی لغت کرتے ہیں۔ انشائیہ "فی سبیل اللہ" میں جونؔ اِسی حوالے سے بات کرتے ہیں اور ایسے علماء کو تقلید کا نشانہ بناتے ہیں جو مذہب کو غلط طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔ اِسی طرح ایوب خان کے مارشل لاء کے بعد جب عائلی قوانین کو منسوخ کرانے کی ایک مہم جاری ہوئی اور یہ مہم عبارت کا درجہ اختیار کر گئی تب بھی یہ مفاد پرست علماء اپنے مطلب اور مفاد کا سوچ رہے تھے۔ انہیں مفاد پرست علماء میں سے ایک منقی جو کہ قومی اسمبلی کے رُکن بھی تھے نے اِن قوانین کے خلاف بیان دیا اور کہا کہ اگر مردوں سے

چار شادیوں کا حق چھین لیا گیا تو حرام کاری میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا اور یہ نسل غلط روش پر چلنا شروع کر دے گی حلانکہ اس دور میں چار شادیوں کی اجازت ہونے کے باوجود حرام کاری موجود تھی۔

اِس لیے جونؔ کہتے ہیں کہ اِن مولویوں کو جو چیز پسند نہیں تھی اِس کو مذہب کے ساتھ جوڑ کر اس کی مخالفت شروع کر دی اور جن باتوں میں ان کا فائدہ تھا اور جو باتیں ان کی پسندیدہ تھیں ان کو مذہب کی آڑ میں جائز قرار دیتے تھے۔ اِن تمام باتوں کے فن میں جونؔ کہتے ہیں کہ اسلام کی تاریخ اٹھا کر دیکھا جائے تو اس تاریک میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں جب اسلام کو بدنام کرنے والے مسلمان چار بیویوں اور متعدد کنیزوں کے ہوتے ہوئے بھی حرام کاری سے باز نہ آئے تھے۔

اس کے ساتھ ہی جونؔ یہ بھی کہتے ہیں کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اسلامی ممالک میں ناجائز نسل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حالانکہ اِس بدی سے غیر اسلامی ممالک تو کیا اسلامی ممالک بھی محفوظ نہیں ہے۔ اس کی مثال تاریخ سے ملتی ہے کہ پہلی صدی ہجری میں ایک ناجائز مگر شہرہ آفاق نومولود زیاد ابیہ نے جنم لیا۔ یہ بھی اسلامی تاریخ ہی میں ہوا۔ اِسی طرح واقعہ حرّہ بھی اسلامی تاریخ سے منسوب ہے جب مسلمان مجاہدین نے مدینے پر چڑھائی کر کے عورتوں کی عزتوں کو لوٹا اور اس وقت کوئی بھی عورت اپنی عزت کو نہ بچا سکی۔

اس لیے جونؔ کہتے ہیں کہ ان موضوعات اور ان تمام باتوں کو دہرانے اور اس پر بحث کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا بلکہ اس سے مسلمان قوم دیگر ممالک کے سامنے صرف شرمندہ ہو گی۔ اس لیے اِن موضوعات کو زیر بحث لانے کے بجائے ان مسائل پر بات کرنے کی ضرورت ہے جو کہ نہ صرف مذہب بلکہ اس قوم کے لیے بھی فائدہ مند ہے۔ جن پر بات کر کے ہم گروہی اور علاقائی تعصبات کے ساتھ فرقہ واریت کو بھی ختم کر سکتے ہیں۔ جس سے نہ صرف ملک ترقی کرے گا بلکہ اسلام بھی صحیح ڈگر پر چلے گا۔

سائنس آج کے دور کی سب سے بڑی ضرورت اور سب سے بڑی سچائی ہے۔ دنیا میں آج جو ترقی ہو رہی ہے سائنس ہی کی مرہونِ منت ہے۔ سائنس نے دنیا کی ترقی کو پہیے لگا دیے اور اس کی رفتار اتنی تیز کر دی کہ جس کی سوچ بھی زمانہ ماضی میں ممکن نہیں تھی۔ سائنس نے انسان کو وہ فکر عطا کیا کہ قدیم زمانے کا کوئی بھی مفکر اس کے سامنے کھڑا نہ ہو سکا۔ بالکل اسی طرح آج سائنسی فکر کے سامنے دنیا کے کسی بھی فکر کی عمارت اپنا وجود برقرار رکھنے میں ناکام نظر آتی ہے۔ توہم پرستی تو ایک طرف فی زمانہ بعض ادیان بھی سائنسی فکر کے اس ریلے کے سامنے بن باندھنا تو ایک طرف اس کا مقابلہ کرنے میں بھی ناکام نظر آتے ہیں۔ ایسے حالات میں اگر کوئی مذہب سائنس کے اِس بڑھتے ہوئے سیلاب کے راستے میں حائل ہو کر اسے اپنے ساتھ

اور خود کو اُس کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو مذہب اسلام چونکہ آخری الہامی مذہب ہے اور اس کے بعد کسی نئے مذہب نے تو آنا نہیں اس لیے اہل اسلام مکمل طور پر کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طریقے سے اسلامی فکر کو اُن خطوط پر استوار کیا جائے جو جدید دور کے بدلتے ہوئے اِن تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکے اور سائنس کے اِس تیزی سے بڑھتے ہوئے سیلاب میں بہہ جانے کے بجائے اپنا وجود قائم رکھ سکے۔ اِسی سلسلے کی ایک کڑی ۱۹۶۰ء میں ہونے والی "اسلامی تحقیق اِدارہ" کی تنظیم تشکیلِ نو ہے۔

اسلام ایک بین الاقوامی مذہب ہے جس کا آغاز عرب سے ہوا اور پھر یہ ایران، عراق وغیرہ سے ہوتے ہوئے برصغیر تک پہنچا لیکن اگر ہم غور سے دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ اِس وقت اسلام کی خاطر صرف اور صرف برصغیر کے لوگ ہی کھڑے ہیں اور ہر طرح کی قربانیاں دے رہے ہین۔ جبکہ وہ ممالک جہاں سے اسلام کا آغاز ہوا اور جن کو صحیح معنوں میں اسلامی ممالک کہا جاسکتا ہے وہ اِس حوالے سے بالکل بے فکر نظر آتے ہیں۔ اِدارہ "تحقیقاتِ اسلامی" کے حوالے سے جونؔ نے کچھ خوش آئند خیالات کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ چند سوالات بھی اُٹھائے ہیں جن پر غور کیے بغیر اس اِدارے سے خاطر خواہ نتائج حاصل کرنے ممکن نظر نہیں آتا۔

اسلام دینِ فطرت ہے اور آخری دین ہونے کی حیثیت سے یہ زندگی کے ہر پہلو پر انسانیت کی رہنمائی کرتا ہے۔ اسلام کی تعلیمات پر غور کیا جائے تو شاید ہی زندگی کا کوئی ایسا موضوع ہو جو اسلام نے نہ چھیڑا ہو لیکن اسلام کی بنیاد چند بنیادی عقائد پر ہیں۔ یعنی عقیدہ توحید، عقیدہ رسالت اور عقیدہ قیامت۔ سو اللہ کو ایک ماننے والے، خاتم النبیین کی رسالت پر یقین کرنے والے اور روزِ آخرت کے طے شدہ ہونے اور مقررہ وقت پر آنے پر یقین رکھنے والے مسلمان کہلاتے ہیں اور یہی اسلام کے بنیادی ارکان ہیں۔ اس کے علاوہ کون کس سیاسی نظریے پر یقین رکھتا ہے یا کس معاشی نظریے پر یقین رکھتا ہے اِس سے اُس کا مسلمان ہونا یا کافر ہونا طے نہیں ہوتا۔ انشائیہ "میدانِ حشر میں" جونؔ یہی بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام عوام پر خدا کی حاکمیت کے بعد اُن کی اپنی حاکمیت کا قائل ہے اور ملوکیت کا مخالف۔ لیکن خلافتِ راشدہ کے بعد جو ملوک و سلاطین اسلامی حکومت میں برسرِ اقتدار رہے ان کے نام کے خطبے بھی پڑھے جاتے رہے لیکن آج تک اُن کے اِس عمل کو نہ تو کسی نے غیر اسلامی کہا نہ ہی انہیں کافر کہا گیا کیونکہ کوئی بھی سیاسی نظریہ رکھنا اسلام کی بنیادی ارکان میں شامل نہیں ہے۔ بالکل اِسی طرح کوئی بھی معاشی نظریہ رکھنا یا کسی بھی معاشی نظریے کو درست ماننا بھی اسلام کے بنیادی عقائد میں شامل نہیں۔ جس کی بنیاد پر کسی کے کفر اور اسلام کا فیصلہ کیا جاسکے۔ مگر ہم وہ بدقسمت ہیں کہ ہم بنیادی باتوں کو چھوڑ کر اِن فروعات کو عین اسلام سمجھتے ہیں اور اِسی کی بنیاد پر لوگوں کے اسلام کو پرکھتے ہوئے اُن پر کفر کے فتوے لگاتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مبارک علی، ڈاکٹر، "تاریخ کے بدلتے نظریات"، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ص ۲۰۱۲ء، ص ۳۰۔

۲۔ مبارک علی، ڈاکٹر، "تاریخ کی باتیں"، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، س ۹، پیشِ لفظ۔

۳۔ جونؔ ایلیاء، "فرنود"، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۴۹۔

۴۔ ایضاً، ص ۳۰۹

۵۔ ایضاً، ص ۲۲۳

۶۔ ایضاً، ص ۱۹۵

۷۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر، "تکلمات (ادبی، فکری اور تہذیبی کالم)"، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۴۴

۸۔ عبدالحق حسرت کاسکنجوی، ڈاکٹر، "ادب، علمی اور فکری زاویے"، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۳۰

۹۔ جونؔ ایلیاء، "فرنود"، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۵۱۹

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۳۹

۱۱۔ احمد ندیم قاسمی، "ندیم کی غزلیں (کلیات)"، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۴۵۸

۱۲۔ جونؔ ایلیاء، "شاہد"، الحمد پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۰ء، ص ۸۷

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۲۱

۱۴۔ جونؔ ایلیاء، "فرنود"، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲، ص ۴۱۸

۱۵۔ ایضاً، ص ۶۹۱

۱۶۔ ایضاً، ص ۷۱۴

پانچواں باب:

"مجموعی جائزہ"

جونؔ ایلیاء شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ نظر نگار بھی تھے۔ اِن کی یہ نثر ان انشائیوں پر مشتمل ہے جو انہوں نے ماہ نامہ انشا، عالمی ڈائجسٹ اور سسپنس ڈائجسٹ میں اداریہ کے طور پر لکھیں تھے۔ جونؔ نہ صرف اپنی شاعری میں مہارت رکھتے تھے بل کہ انہیں نثر نگاری پر بھی عبور حاصل تھا اِس لیے ان کے یہ انشائیے اُردو اَدب میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ جس طرح جونؔ کی شاعری میں ہمیں موضوعات میں تنوع نظر آتا ہے بالکل اِسی طرح انہوں نے اپنے انشائیوں میں مختلف قسم کے مضامین کو جگہ دیں۔ جونؔ اپنے انشائیوں کا مواد اپنے اِرد گرد کے ماحول سے لینے کے ساتھ ساتھ اپنے داخلی کرب کو بھی الفاظ کا روپ دے کر قارئین کے سامنے لاتا ہے۔ یہ داخلی کرب ذاتی ہونے کے ساتھ ساتھ اجتماعی بھی تھا کیونکہ کوئی بھی ادیب اپنے معاشرے کے حالات سے نظریں چرا نہیں سکتا اور نہ ہی اپنی تاریخ کو فراموش کر سکتا ہے اِس لیے وہ معاشرے پر غور کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ کے اتار چڑھاؤ کو بھی ذہن میں رکھتے ہیں اور اپنے دور کی سیاسی و مذہبی صورتِ حال پر بھی ناقدانہ نگاہ رکھتے ہیں۔

جونؔ ایلیاء ایک ایسے انشائیہ نگار تھے جن کے انشائیوں کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ اِن کے ہاں کثرت سے پائے جانے والے موضوعات میں سماجی موضوعات، سیاسی و فلسفیانہ، تاریخی، علمی و ادبی، نفسیاتی اور مذہبی موضوعات ہیں۔ یعنی کہ جونؔ نے کسی مخصوص موضوع پر قلم نہیں اُٹھایا بلکہ انہوں نے ہر موضوع کو بیان کیا ہے۔ جونؔ کا مقصد صرف اِن موضوعات کو بیان کر دینا نہیں تھا بلکہ وہ زندگی کے ہر پہلو پر غور و فکر کر کے ان مسائل، اس کی اچھائیوں اور برائیوں سے آشنا ہو کر نہایت مدبرانہ اور اصلاحانہ انداز میں بیان کرتے تھے تاکہ ان کی پہچان کرنے کا جو اصلاح کا مقصد ہے وہ پورا ہو سکے۔ کیونکہ جونؔ ایک ایسے تخلیق کار تھے جو کہ ایک مثالی معاشرے کا خواب دیکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ اس کے حصول کے لیے کوشش کی جائے۔

ادب چونکہ معاشرے کا آئینہ دار ہوتا ہے اور ادیب معاشرے کی ہی عکاسی کرتا ہے۔ ادیب معاشرے کا اہم فرد ہوتے ہیں۔ وہ عام لوگوں کی نسبت زیادہ حساس ہوتا ہے۔ اس لیے وہ معاشرے کے نشیب و فراز اور عدم توازن کو زیادہ شدت سے محسوس کرتا ہے۔ ادیب معاشرے کے مسائل اور معاشرے

کے افراد کی بے حسی پر کڑھتا ہے اِس لیے وہ اپنی تخلیقات میں اِس کا لحاظ کر کے اپنے اندر کا غبار نکالتا ہے۔ جونؔ بھی معاشرے کے اِسی اتار چڑھاؤ اور عدم توازن کی کیفیت کو شدت سے محسوس کرتے تھے۔ اس لیے اِن کے سماجی موضوعات پر مبنی انشائیوں میں اس کا واضح اظہار ملتا ہے۔ سماجی موضوعات میں معاشرتی بے حسی، سماجی بے انصافی، غربت، معاشی استحصال، معاشرے اور سماج میں پھیلا عدم توازن، بے اطمینانی، نفرت، لسانی تضادات، علاقائی اور گروہی تقسیم، قتل و غارت گری، عصمت فروشی، خود غرضی، اظہار رائے کی پابندی، ادیبوں کی ناقدری، عیب جوئی اور قانون کی بے حرمتی جیسے موضعات کو جونؔ نے اپنے انشائیوں میں بیان کیا ہے۔ جونؔ کے انشائیوں میں یہ سماجی موضوعات اپنی پوری سچائی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ جونؔ کے ہاں سماجی شعور پوری بالیدگی اور پختگی کے ساتھ اس انداز میں نظر آتا ہے کہ سماج کا بھیانک چہرہ ہمارے سامنے بے نقاب ہو جاتا ہے۔

جونؔ کے سماجی موضوعات پر مبنی انشائیے ان کے داخلی کرب اور خارجی واقفیت دونوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ جبر و استحصال، ناانصافی، طبقاتی تقسیم، تصنع، جھوٹ، ریاکاری اور اس جیسی دوسری معاشرتی اور اخلاقی برائیوں نے انسان اور انسانی معاشرے کو شدید طور پر متاثر کیا ہے۔ جونؔ معاشرے میں موجود طبقاتی تقسیم اور اس نظام کے خلاف تھے جس کے تحت صرف ایک ہی طبقے تک تمام وسائل محدود ہو کر رہ جاتے ہیں اور غریب افراد اپنی بنیادی ضروریات کو ترستے رہ جاتے ہیں۔ اس طرح ان کا معاشی استحصال ہوتا ہے اور ایک طبقہ امیر سے امیر تر بنتا جاتا ہے جبکہ غریب افراد غربت کا مزید شکار ہو جاتے ہیں اور یوں ان دونوں طبقوں کے درمیان نفرت کی ایک دیوار قائم ہو جاتی ہے۔ جونؔ اپنے متعدد انشائیوں میں اِس سماجی طبقاتی نظام کو بیان کرتے ہیں جس میں ان کے انشائیے سب سے پہلے، بنیادی مسئلہ، روگ، محاسبہ اور بھوک شامل ہیں۔ اِن تمام انشائیوں میں جونؔ اِس معاشی ناانصافی کو بیان کرتے ہیں جو کہ معاشرے میں ایک بہت بڑا بگاڑ پیدا کر دیتا ہے۔

جونؔ اس طبقاتی تقسیم کے ساتھ اِس اعلیٰ طبقے کی بے حسی کو بھی بیان کرتے ہیں کیونکہ یہ افراد اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ انہیں اپنی دولت کی نمود و نمائش کی تو پرواہ رہتی ہے لیکن اِن غریب افراد کے دُکھوں سے کوئی سروکار نہیں بل کہ یہ خود غرضی میں یہاں تک پہنچ جاتے ہیں کہ اِن کے حقوق بھی چھیننا شروع کر دیتے ہیں تاکہ یہ طبقہ کسی بھی طرح سے معاشی طور پر مستحکم نہ ہو سکے کیونکہ انہیں اِس بات کا خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے اپنے حقوق کا مطالبہ کر دیا تو کہیں اس مقام و مرتبے اور عیش و آرام سے ہم محروم نہ ہو

جائیں۔ اس لیے یہ طبقہ معاشی طور پر کبھی انہیں اُوپر اُٹھنے ہی نہیں دیتا۔ جونؔ اپنے متعدد انشائیوں میں معاشرے کی اِسی بے حسی کو بے نقاب کر کے قاری کے سامنے لاتے ہیں۔ اور نہ صرف یہ اِس ناانصافی کو بیان کرتے ہیں بل کہ اس کے ساتھ ساتھ وہ اِس غریب طبقے کو حوصلہ بھی دیتے ہیں۔ انہیں اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنے اور اپنے حقوق کو پہنچاننے کی تلقین کرتے ہیں اور ساتھ ہی اِس بے حس طبقے کو اِن غریب لوگوں کی محرومی کا احساس بھی دلاتے ہیں کہ جو کہ بنیادی ضروریات کے لیے تگ و دو کرتے رہتے ہیں اور بعض اوقات یہ تگ و دو بھی بے کار رہتی ہے اور نوبت فاقوں تک آجاتی ہے۔

ادب سے تعلق رکھنے والے افراد چاہے اپنے خیالات و احساسات کا اظہار شاعری میں کرتے ہو یا نثر میں یا کسی بھی صنف میں کرتے ہو وہ معاشرے کی اِس ناہمواری کا تذکرہ اپنی تخلیق میں ضرور کرتا ہے کیونکہ یہ ہمارے سماج کا ایسا مسئلہ ہے جس کا شکار معاشرے کے سبھی افراد ہوئے ہیں اور اس مسئلے کے حل کے ساتھ ہی اور بہت سے دیگر سماجی مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔ اِس لیے جس طرح اس مسئلے کو ہر ادیب اپنی تخلیق میں بیان کرتا ہے ویسے ہی جونؔ نے بھی اپنے انشائیوں میں اس کو بیان کیا ہے تاکہ یہ تقسیم ختم ہو سکے اور معاشرہ ایک درست ڈگر پر چل سکے۔

جونؔ کے سماجی موضوعات پر مبنی انشائیوں میں ایسے انشایئے بھی موجود ہیں جن میں وہ معاشرے کی ان برائیوں ک و بے نقاب کرتے ہیں جس کی وجہ سے معاشرے کا امن و سکون تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ جونؔ اپنے انشائیوں "انسان کا شیطان" اور "جرم" میں معاشرے میں موجود قتل و غارب گری، چوری اور اغوا برائے تاوان کی وارداتوں کا ذکر کرتے ہیں کہ یہ جرائم ایسے ہیں جو کہ آہستہ آہستہ اِس طرح پروان چڑھتے ہیں کہ یہ معاشرے کی بنیادیں تک ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ جس سے معاشرے کا ہر فرد خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ یہ جرائم پہلے بہت بڑے جرائم مانے اور سمجھے جاتے ہیں لیکن اب یہ اس حد تک پروان چڑھ گئے کہ یہ اب معمولی نوعیت کے حامل لگتے ہیں۔ اس لیے جون تنبیہہ کرتے ہیں کہ اِن جرائم کو اگر شروع ہی سے روکا جائے اور ان کا ارتکاب کرنے والوں کو سخت سسزائیں دی جائیں تو یہ جرائم کبھی بھی اس طرح پروان نہیں چڑھتے لیکن ہمارے معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ جب پانی کے اوپر سے گزر جاتا ہے تب ہم اس پر توجہ دیتے ہیں اور تب کوشش کرنے سے بھی خاطر خواہ نتائج بر آمد نہیں ہوتے کیونکہ یہ جرائم معاشرے کی جڑوں میں پیوست ہو چکے ہوتے ہیں اور پھر انہیں مکمل طور پر ختم کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ایسے ہی سماجی برائیوں میں ایک عصمت فروشی بھی ہے جس کا ذکر جونؔ اپنے انشائیے میں کرتے ہیں۔ یہ بھی ایسی برائی ہے جس پر ابتدا ہی سے قابو پانے کی ضرورت ہے اس لیے جونؔ ان ذرائع کو ہی ختم کرنے کی تلقین کرتے ہیں جو کہ اس برائی کو معاشرے میں پھیلانے کا سبب بنتے ہیں۔ جن میں عریاں رقص، فلمیں، جسم کی نمائش اور مختلف جگہوں پر آویزاں تصاویر شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جونؔ نوجوانوں کی غلط تربیت، بے وجہ قیود اور خراب ماحول کو بھی اس کا ایک بڑا سبب گردانتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ غیر منصفانہ نظامِ معیشت اوعر سماج کے بتائے ہوئے غلط ضابطے بھی اِس برائی کے پنپنے کی وجہ بنتے ہیں۔ اس کی برائی کی مخالفت نہ صرف اسلام کرتا ہے بل کہ معاشرہ بھی اس کو انتہائی شرمناک فعل قرار دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ معاشرے کے افراد اس اخلاقی برائی سے پاک ہو اِس لیے جونؔ بھی اس موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں۔

کوئی بھی قوم اس وقت ترقی کرتی ہے جب وہ شعور رکھتی ہو اور شعور صرف تعلیم حاصل کر کے ہی آتا ہے اس لیے جونؔ جہالت کے خلاف اپنے انشائیوں میں قلم اُٹھاتے ہیں تا کہ اس معاشرے سے جہالت کے اندھیروں کو ختم کر کے تعلیم کی روشنی پھیلائی جائے۔ کیونکہ ہمارے معاشرے میں ایسے بہت سے افراد ہیں جو کہ اپنی کم علمی کے سبب ایسے قوانین کی بھی فی لغت کرتے ہیں جو ان کے فائدے کے لیے بنائے جاتے ہیں اور یہ لوگ چونکہ تعلیم سے بہرہ ور ہوتے ہیں اس لیے یہ اپنے حقوق کو پہچان نہیں پاتے اور نہ ہی اس کے لیے آواز بلند کر پاتے ہیں کیونکہ جب یہ اپنے حقوق کو نہیں پہچانے گے انہیں اپنے حقوق کا شعور ہی نہیں ہو گا تو یہ اس کے لیے حصول کے لیے تگ و دو بھی نہیں کر پائیں گے اور وہ اپنی موجودہ حالت کو بدلنے کے بجائے اسے اللہ کی رضا سمجھ کر اِسی پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ اس لیے جونؔ اپنے انشائیوں میں اس بات کو بیان کرتے ہیں تا کہ معاشرے میں تعلیم کے لیے مناسب مواقع فراہم کیے جائیں اور معارے کے افراد کو اس کی اہمیت سے روشناس کرایا جائے۔

جونؔ طبقاتی قسیم اور سماج کی دیگر برائیوں کا ذکر کرنے کے ساتھ دولت کے ان پوجاریوں کا ذکر بھی کرتے ہیں جو کہ اس دنیا کو ایک تجارت گاہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ یہاں ہر چیز کی قیمت لگاتے ہیں، چاہے یہ قیمت انسانوں کی ہو یا کسی بھی بے جان چیز کی۔ یہاں تک کہ اس معاشرے میں سچ کی قیمت بھی لگائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے سچ اس معاشرے میں ناپید ہے۔ اس معاشرے میں کوئی بھی پورا سچ بولتا ہوا نظر نہیں آتا کیونکہ سچ کے عوض بھی مال و دولت حاسل کر لی گئی ہے۔ اس لیے اِس معاشرے کو بدلنے کے لیے کسی کے سچ کا انتظار کرنے کے بجائے حرکت و عمل سے کام لے کر جدوجہد کرنا چاہیے۔

جونؔ جہاں سچ کے بک جانے کی بات کرتے ہیں وہیں وہ اس سوچ کی بات بھی کرتے ہیں جو کہ اس سماج میں بیچ دی جاتی ہے۔ جونؔ "جو کہا گیا" میں اِسی المیے کو بیان کرتے ہیں کہ ادیب معاشرے کے معزز ترین افراد ہوتے ہیں لیکن اِن غیر جانبدار ادیبوں کے علاوہ اس معاشرے میں ایسے ادیب بھی موجود ہوتے ہیں جو کہ اپنی رائے کو اور اپنی سوچ کو بیچ ڈالتے ہیں اور یوں وہ دوسروں کی سوچ کو اپنا لیتے ہیں۔ جونؔ کے نزدیک یہ بات انتہائی قابلِ ملامت ہے کہ ایک لکھاری اپنی سوچ کو بیچ ڈالتا ہے اور یوں وہ اپنی رائے کو دوسروں کے تابع کرنے کے لیے اس کی قیمت لگاتا ہے۔ جونؔ آزاد سوچ اور اپنی ذاتی رائے رکھنے کے قائل تھے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص چاہے معاشرے سے نفرت رکھنے کی رائے ہی کیوں نہ قائم کر لیں یہ بھی قابلِ تحسین ہے کیونکہ اس شخص نے اپنی رائے کو آزاد رکھا اور اس سوچ اور رائے کا مول نہیں لگایا۔ جونؔ اِن تمام باتوں کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہر شخص کا سوچنے کا انداز مختلف ہوتا ہے اِس لیے ہر ایک کی رائے کو سننا اور سمجھنا چاہیے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں معاشی لحاظ سے طبقاتی نظام رائج ہونے کے ساتھ اظہار رائے کے حوالے سے بھی تقسیم نظر آتی ہے۔ اس معاشرے میں صرف مخصوص لوگوں کو ہی بولنے کا حق دیا گیا ہے جو نہایت دکھ کی بات ہے کیونکہ جب خدا نے تمام انسانوں کو برابر کے حقوق دیے ہیں تو انسان کیوں انہیں طبقوں اور گروہوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور یوں ان سے تمام حقوق چھیننے کے ساتھ ساتھ بولنے کا حق بھی چھین لیا جاتا ہے۔ انہی تمام باتوں کو جونؔ اپنے انشائیوں "آواز"، "بیان" اور "اعتماد" میں بیان کرتے ہیں۔

اِسی طرح جونؔ ان نوجوان طلباء کا ذکر بھی اپنے انشائیوں میں کرتے ہیں جن کو درس گاہوں اور تعلیمی اداروں سے دور رکھا جاتا ہے کیونکہ تعلیم انسان کے اندر شعور پیدا کرتی ہے اور جب شعور پیدا ہوتا ہے تو انسان اچھے اور برے کی پہچان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے حقوق سے بھی آگاہ ہوتا ہے اور پھر اس پر دنیا کے بہت سے حقائق سامنے آتے ہیں۔ اور وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کریں۔ اس لیے ہمارے سماج میں ایسے طلبہ کو درس گاہوں سے دور رکھا جاتا ہے اور خاص کر ان طلبہ کو جو سوچ بچار کر کے اپنی کوئی رائے رکھنا چاہتے ہیں۔ جونؔ اپنے انشائیے میں معاشرے کی اس حقیقت پر بھی قلم اُٹھاتا نظر آتے ہیں اِسی طرح جونؔ اپنے انشائیے "بادِ رات" میں معاشرے کے عدم توازن کا ذکر کرنے کے بجائے ادب میں ہونے والی بے اعتدالیوں کا ذکر کرتے ہیں کیونکہ ادب معاشرے کا آئینہ دار ہوتا ہے اِس لیے اس میں معاشرے کی تمام اچھائیوں اور برائیوں کو بیان کیا جاتا ہے لیکن جونؔ کے مطابق اَب ادب میں صرف معاشرے کی برائیوں

کو ہی بے نقاب کیا جاتا ہے۔ جونؔ خاص کر شاعری کے حوالے سے بات کرتے ہیں کہ یہ زندگی کے حسن کا کام ہے لیکن ہم نے اسے صرف دکھوں کی زبان بنا کر رکھ دیا ہے اور پہلے اس میں دل کا کرب دیکھا جاتا تھا لیکن اب اس میں کارکردگی دیکھی جاتی ہے جس کی وجہ سے یہ اب پیشے کی حیثیت اختیار کر گئی ہے اور جونؔ کے نزدیک شاعری ہرگز کوئی پیشہ نہیں ہے۔

اِسی طرح جونؔ ادیبوں کی ناقدری کا نوحہ بھی بیان کرتے ہیں کہ پہلے دور میں ادیبوں کو بہت عزت دی جاتی تھی لیکن موجودہ دور میں ادیبوں کو وہ اہمیت اور عزت نہیں دی جاتی جو ان کا حق ہے۔ اس کے مقابلے میں اداکاروں، لطیفہ لوگوں اور مسخروں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ جونؔ اِن لکھاریوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ جن کے پاس علم کا ذخیرہ نہ ہونے کے باوجود کئی کتابوں اور کئی دیوانوں کے خالق ہیں۔ ایسے اشخاص خود کو اُردو کے اہلِ قلم میں شمار کرتے ہیں لیکن ان کا اپنا املاء تک درست نہیں ہوتا۔ جوانؔ ایسے لکھاریوں پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ اس سب کے باوجود معاشرے سے اُمید لگائے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ جونؔ اپنے انشائیوں میں اس بات کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ ہم نے اپنے معیارات بدل دیے۔ پہلے بڑائی کی بنیاد علم و فضیلت پر تھی لیکن اب صرف دولت پر ہے۔ اِس لیے جونؔ کے نزدیک جب ہم اپنے معیارات بدل لیتے ہیں تو پھر اپنی کم علمی کے باعث ایسے لوگوں کو عزت دیتے ہیں اور انہیں اپنا مسیحا سمجھتے ہیں جو ہماری بھلائی کے لیے کچھ کرنے کے بجائے ہمیں مزید پستی کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔

جونؔ کے سماجی موضوعات پر مبنی انشائیوں میں حکمرانوں پر تنقید بھی ملتی ہیں کہ یہ ایسا طبقہ ہے جو ملک کی ترقی کے دعوے دار تو ہیں لیکن حقیقت میں کچھ نہیں کرتے اور قومی مفاد پر اپنے مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایسے ہی حکمرانوں کی بے حسی پر جونؔ گہرے دُکھ کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے دُکھوں اور پریشانیوں کا حل نکالنے اور انہیں سہولتیں فراہم کرنے کے بجائے مزید مسائل میں الجھا دیا جاتا ہے تاکہ یہ انہی مسئلوں میں الجھے رہیں اور وہ اپنے مفادات حاصل کرتے رہیں۔ انہیں دیگر مسائل میں علاقائی اور گروہی مسائل بھی شامل ہیں اور نسلی اور لسانی امتیازات بھی۔ لسانی حوالے سے خاص کر جونؔ اُردو اور سندھی زبان کے جھگڑے کی بات کرتے ہیں۔ جس کی بناء پر اُردو اور سندھی زبان سے تعلق رکھنے والے افراد ان زبانوں کے جھگڑے میں پڑے رہتے ہیں جس کا فائدہ اعلیٰ طبقہ اُٹھاتا ہے۔ یہاں تک کہ اِن جھگڑوں کو پیدا کرنے والے ہی وہ افراد تھے جو کہ اس ملک کی ترقی میں رکاوٹیں ڈالنا چاہتے تھے اور غریبوں کے حقوق کو چھینتے تھے تاکہ یہ لوگ ان مسائل

میں الجھے رہے اور اپنے حق کے لیے کبھی نہ اٹھیں۔ حالانکہ جونؔ کہتے ہیں کہ ان لوگوں کو آپس میں لڑنے کے بجائے سب کو مل کر ان سیاستدانوں، لٹیروں اور غاصبوں سے جنگ کرنی چاہیے۔

جونؔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب بھی تھے اس لیے ان کے دوستوں کا تعلق بھی ادب سے تھا۔ جونؔ اپنے انشائیوں میں سماج کے مختلف حالات کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ان دوستوں کا ذکر بھی کرتے ہیں جو کہ اِس دنیا سے چلے جانے کے باوجود آج تک ادب میں زندہ ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ان دوستوں کا ذکر بھی کرتے ہیں جو ان کی اُس تنہائی کے وقت ان کے ساتھ تھے۔ جب جونؔ امروہی سے ہجرت کر کے کراچی آئے تھے۔ جونؔ اپنے انشائیوں میں اپنی اس ہجرت کے کرب کو بھی بیان کیا کرتے ہیں جو انہیں امروہہ سے کراچی کرنا پڑی۔ اس لیے ان کی انشائیوں میں ہجرت کا یہ کرب بھی نظر آتا ہے اور وہ جس طرح پاکستان سے محبت کرتے ہیں بالکل اِسی طرح ہندوستان سے محبت کا اظہار بھی کرتے ہیں لیکن ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اِن دونوں ممالک کے درمیان نفرت کی ایک ایسی دیوار کھڑی ہے جو شاید کبھی ختم نہ ہو کیونکہ اتنے سال گزرنے کے بعد اِس نفرت کی شدت میں کمی آنے کے بجائے اس میں اضافہ ہوا ہے اور جونؔ اس نفرت کا ذمہ دار انگریزوں کو ٹھہراتے ہیں کیونکہ انگریزوں نے شروع ہی سے مسلمانوں کے حقوق ان سے چھین کر ہندوؤں کو دیے اور یوں اِن دونوں قوموں کے درمیان نفرت کو پروان چڑھایا۔ جس کا اظہار جونؔ اپنے انشائیے "تاریخ کی نکوئی"، "سمجھوتا"، اور سفید کنپٹیوں کی سالگرہ میں کرتے ہیں۔

ساتھ ہی اس بات کو بھی واضح کرتے ہیں کہ محبت ایسا جذبہ ہے جس سے تمام اختلافات ختم کیے جاسکتے ہیں اور پھر سے امن و سکون کو بحال کیا جاسکتا ہے۔

جونؔ اپنے انشائیوں میں جہاں دیگر موضوعات پر بات کرتے ہیں وہیں انسانوں کی اس بے حسی پر بھی انشائیے لکھتے ہیں جس کی وجہ سے اس نے اپنے مقام کو نہایت پست کر لیا ہے۔ جونؔ کہتے ہیں کہ انسان اتنا بے حس ہو چکا ہے کہ نہ صرف وہ اپنے ہنر کی قیمت لگاتا ہے بل کہ آج کے دور میں انسانوں کی بھی قیمت لگائی جاتی ہے۔ اسی طرح جونؔ معاشرے میں موجود منافقت سے بھی پردہ اُٹھاتے نظر آتے ہیں اور انسان کے دوغلے پن کو بھی بیان کرتے ہیں اور ساتھ ہی انسانوں میں انسانیت کے ختم ہو جانے کا شکوہ بھی کرتے ہیں کہ انسان شعور رکھنے کے باوجود اپنے ہی انسانوں کے خون کا پیاسا ہے اور اپنے جیسے ہی انسانوں کو قتل کرتا ہے۔ اِسی طرح کراچی کے ابتر حالت، اور وہاں آئے روز کی قتل و غارب کا نوحہ بھی بیان کرتے ہیں کہ وہاں کے حالات اس قدر بگڑے چکے ہیں کہ اگلے پل کی کوئی اُمید نہیں کہ اگلے پل کیا سے کیا ہو جائے۔ ان تمام خامیوں،

برائیوں اور کوتائیوں پر جونؔ کہتے ہیں کہ ہمیں ابھی تک مہلت ملی ہے کہ ہم خود کو سدھار لیں۔ اگرچہ مہلت ختم ہوگئی تو ہمارا نام ونشان اس صفحہء ہستی سے مٹ جائے گا۔

ایسے ہی جونؔ موضوعات میں ایک طرف سائنس کی اہمیت، ترقی اور اس سے انسان کی زندگی میں آنے والی آسانی کی بات کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ اس کے نقصانات اور اس سے ہونے والی تباہ کاریوں کو بھی بیان کرتے ہیں کیونکہ جونؔ کے مطابق ایک طرف تو یہ انسان کے لیے فائدہ مند ہے لیکن دوسری طرف اسی نے انسانوں کی نسلوں کو تباہ و برباد کیا۔ اور اس کے صحیح اور غلط استعمال کا ذمہ دار صرف انسان ہے۔ اس کے ساتھ جونؔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم طول و عرض کی جانب تو پھیل رہے ہیں لیکن ذہنی لحاظ سے آج بھی غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم تہذیبی، زمینی اور معاشرتی ہر اعتبار سے مغرب کے غلام ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جونؔ کراچی کے دگرگوں حالات کا بھی ذکر کرتے ہیں اور اپنے انشائیوں میں کراچی میں امن و امان کے فقدان اور وہاں ہونے والی قتل و غارب کو بھی بیان کرتے ہیں اور ان تمام کراچی کے حالات ک وجونؔ اپنے انشائیوں "مرثیہِ شہر کراچی؛" ایک طور " اور "سلامتی" میں بیان کرتے ہیں اور کراچی ہی کے ایک رہنے والے مشہور حکیم محمد سعید کی موت پر اظہارِ افسوس بھی کرتے ہیں کیونکہ انہیں ان کی سچائی کی سزا موت کی صوت میں ملی۔ اس کے ساتھ ہی جونؔ انشائیہ "بے ضمیر" میں ان بے بس اور مظلوم لوگوں کی حالت کو بیان کرتے ہیں جو سقوطِ ڈھاکہ کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں ہی رہ گئے تھے اور چونکہ یہ غیر بنگالی تھے اس لیے اس تقسیم کے وقت اور بعد میں بھی انہیں ظلم و ستم کا نشانہ بنا گیا اور ان کو نہ تو مشرقی پاکستان کی حکومت اپنے ملک میں جگہ دینے کو تیار ہیں اور نہ ہی پاکستان کے حکمران انہیں پاکستان میں لانے کے حامی ہیں۔ اس لیے جونؔ اِن کی بے بستی اور مظلومی کو اپنے انشائیے میں بیان کرتے ہیں اور ساتھ ہی ادیبوں کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں جو ان کے حق کے لیے لکھ نہیں رہیں اور نہ ہی ان کی آواز دوسروں تک پہنچا رہے ہیں۔

جونؔ اپنے انشائیوں میں جہاں سماج کے دیگر مسائل پر قلم اُٹھاتے ہیں وہاں وہ آزادی کے بعد پاکستان کی ترقی نہ ہونے پر دکھ کا اظہار کتے ہیں کہ ہم نے آزادی حاصل کرلی ہے لیکن آج بھی ہم وہیں کھڑے ہیں اور کوئی ترقی نہیں کی اور نہ ہی ہمارے حکمرانوں نے اپنے مفاد سے ہٹ کر ملک و قوم اور عوام کے مفاد میں سوچا اور حکمران چونکہ عوام کے ہی عکاس ہوتے ہیں اس لیے جونؔ حکمرانوں کے ساتھ عوام کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ یہی تمام باتیں جونؔ اپنے انشائیوں "بے حاصل"، "حساب فہمی"، "ہر بات کا جواب" اور اکیسویں صدی" میں کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان طاقت ور افراد کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں جو کہ اس ملک کے

قانون تو بناتے ہیں لیکن پھر انہیں قوانین کو اپنی طاقت کے بل بوتے پر توڑتے ہیں۔ اِسی طرح پاکستان کے ایٹمی ملک بننے کے واقع کو بھی اپنے انشائیے "دنگل" میں بیان کرتے ہیں اور ساتھ ہی جونؔ اپنے انشائیے "جنتِ ارضی-2" میں قوم سے شکوہ بھی کرتے ہیں کہ پہلے ان میں آگے بڑھنے کا جذبہ موجود تھا اور یہ مثالی معاشرے کے خواب دیکھتے تھے اور اس کے لیے کوشش کرتے تھے لیکن اب یہ مکمل طور پر مایوس ہو چکے ہیں اور انہیں اپنے اچھے مستقبل کی کوئی اُمید نہیں لیکن جونؔ ان کو مایوسی ختم کرنے اور آگے بڑھنے کا راستہ بتاتے ہیں جس پر چل کر وہ اس ملک کو اپنے لیے جنت بنا سکتے ہیں۔ اِسی طرح جونؔ معاشرے کے اس المیے کی طرف بھی ہماری توجہ دلاتے ہیں کہ جس طرح ابتداء سے ہی جدت کی مخالفت کی گئی اور اس کے نتیجے میں دانش وروں کو سزائیں دی گئی بالکل اِسی طرح آج کے دور میں بھی جدت کی اِسی طرح مخالت کی جاتی ہے اِس لیے اس قوم کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اپنے خیالات میں وسعت پیدا کی جائے اور نئی چیز اور نئے خیالات کو اپنایا جائے۔

جونؔ ایک ایسے نثر نگار تھے جنہوں نے اپنے انشائیوں میں کسی محدود موضوع کو بیان نہیں کیا ان کے ہاں معاشرے کے ہر پہلو کے حوالے سے انشائیے ملتے ہیں اس کے ساتھ ہی اگر سیاسی حوالے سے بات کی جائے تو اِن کی سیاست پر بھی نگاہ تھی اور نہ صرف انہوں نے پاکستانی سیاست کو اپنے انشائیوں میں جگہ دی بل کہ عالمی سیاست کے حوالے سے بھی اگر خاص واقعہ رونما ہوتا ہے تو اس کو جونؔ اپنے انشائیوں میں بیان کرتے تھے۔ جونؔ سیاسی موضوعات پر مبنی انشائیوں میں حکمرانوں پر تنقید بھی کرتے ہیں اور قانون کی بے حرمتی کرنے پر اعلیٰ طبقع سے تعلق رکھنے والے افراد کو قانون کی پاسداری کرنے کی بھی تلقین کرتے ہیں۔ اظہارِ رائے کی آزادی، سقوطِ ڈھاکہ، ایوب خان کے مارشل لاء، یحییٰ کے دور اور اس دور کے مارشل لاء، غیر بنگالیوں کا ذکر، مسلم لیگ، پاکستان کا آئین، پاک ایران دوستی، پاک بھارت دشمنی اور مسئلہ کشمیر جیسے موضوعات پر جونؔ قلم اُٹھاتے ہیں۔ اِسی طرح عالمی سیاست کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو امن کے حق میں آواز نہ اُٹھانے پر اقوامِ متحدہ اور دیگر ممالک پر تنقید کرنے کے ساتھ ساتھ امریکا اور روس کی جنگ کے امکانات کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور افریقہ میں کالے رنگ کے افراد کی نسل کشی پر اظہارِ افسوس بھی کرتے ہیں یوں جونؔ محدود موضوع کو اپنے انشائیوں میں جگہ نہیں دیتے بل کہ متنوع قسم کے موضوعات کو بیان کرتے ہیں۔

جونؔ سیاسی بصیر کے بھی حامل تھے جس کا ثبوت اِن کے سیاسی موضوعات پر مبنی انشائیوں میں۔ جونؔ نے اپنے انشائیوں میں سیاسیت کے حوالے سے بہت عمدہ نقطے سامنے لائے ہیں۔ حکمران قوم کا ایسا طبقہ ہے جو

کہ اس قوم کی ترقی اور پستی دونوں میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لیے جونؔ حکمرانوں کو ان کی مفاد پرستی پر انہیں ہدتِ تنقید بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ طبقہ صرف اپنے مفاد کے لیے سوچتا اور کام کرتا ہے حالانکہ ان کا مقصد صرف قوم کی بھلائی اور ملک کی ترقی ہونا چاہیے تھا لیکن یہ حکمران عوام کو ترقی دینے کے بجائے اِن کے راستوں میں مختلف طرح سے رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں اور انہیں دیگر مسائل میں اِس طرح الجھا دیتے ہیں کہ انہیں اپنے حقوق کا ادراک ہی نہ ہو سکے اور یہ کبھی اپنے حقوق کو نہ پہچان پائیں۔ اس کے لیے وہ عوام کو تعلیم سے دور رکھتے ہیں تا کہ ان میں کبھی شعور اُجاگر نہ ہو سکے اور اپنے حق کے لیے آواز بلند نہ کریں اور ان کا کاروبار آسانی سے چلتا رہے۔ اِسی طرح یہ حکمران ملک کے لیے نہ خود کچھ کرتے ہیں اور نہ قوم کے ان مخلص افراد کو کچھ کرنے دیتے ہیں جو قوم کے لیے سوچتے ہیں اور ان کی بھلائی کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں اِس کے ساتھ ہی جونؔ اِن حکمرانوں کو مزید بے نقاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہی خود غرض طبقہ ہے جو عوام کو کبھی لسانی جھگڑے میں الجھاتے ہیں تو کبھی علاقائی بنیادوں پر تنازعات کھڑے کرتے ہیں تا کہ قوم انہی مسئلوں میں الجھی رہے اور ان کے مفاد کے راستے پر کبھی نہ آئے۔ لیکن جونؔ ان تمام حقیقتوں کے باوجود یہ بھی کہتے ہیں کہ حکمران عوام کے ہی عکاس نہیں ہیں۔ اس لیے یہ طبقہ اس وقت تک خامیوں سے دور نہیں ہو سکتا اور قوم کی بھلائی کے لیے نہیں سوچ سکتا جب تک عوام خود کو ٹھیک نہ کریں اور خود کو برائیوں سے دور نہ کریں لیکن نام و ر فلسفی افلاطون کے مطابق حکمران کو دانشوروں اور حکیموں کے گروہ سے آنا چاہیے جو اس قوم کے دُکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے ہیں اور قوم کی بھلائی کے لیے سوچتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جونؔ یہ بھی کہتے ہیں کہ پاکستان کو صرف ابتداء ہی میں چند مخلص لیڈر ملیں جو قوم کی ترقی کے لیے کوشاں تھے اور آج کے حکمران اپنے مفاد کے لیے قانون بناتے ہیں اور پھر خود ہی اس قانون کو توڑتے ہیں۔ جب تک حکمران قانون کی پاسداری نہیں کریں گے تو عوام سے بھی قانون پر عمل ہونے کی اُمید نہیں کی جا سکتی۔ جونؔ یہ تمام باتیں اپنے انشائیوں "بار بار"، "ایک خط"، "حساب فہمی" اور بہت سے دیگر انشائیوں میں بیان کرتے ہیں۔

اقتدار حاصل کرنے اور حکومت بنانے کے لیے مختلف سیاسی پارٹیاں انتخابات میں حصہ لیتی ہیں اور پھر کوئی ایک پارٹی ہی عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوتی ہے اور اقتدار میں آتی ہے لیکن بعض اوقات صورتِ حال مختلف ہوتی ہے اور عوام کی روٹی کے بغیر ہی کوئی شخص اقتدار حاصل کر لیتا ہے۔ ایسا تب ہوتا ہے جب کوئی فوج کا سربراہ ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیتا ہے اور پھر فوج کی حکومت آجاتی ہے۔ جونؔ پاکستان کی سیاست میں لگنے والے ایوب خان کے مارل لاء کا ذکر کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس دور میں ہونے والی ترقی اور

لوگوں کی سوچ میں ترقی کرنے کی لگن اور متحد ہو کر کوشش کرنے کا جذبہ بھی بیان کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی افسوس کا اظہار بھی کرتے ہیں کیونکہ اس مارشل لاء کے ہٹتے ہی یہ قوم اپنی پرانی سوچ اور اپنے پرانے مسائل میں دوبارہ الجھ گئی اور ترقی کی تمام اُمیدیں دم توڑ گئی۔ اس طرح جونؔ اپنے انشائیوں میں پاکستان کی سیاست میں ہونے والی ہر خاص تبدیلی کو بیان کرتے ہیں۔

جونؔ اپنے انشائیوں میں جہاں ایوب خان کے دور کا ذکر کرتے ہیں وہیں وہ جنرل یحییٰ کے دور کو نہایت تفصیل اور تسلسل کے ساتھ اپنے معتدد انشائیوں میں بیان کرتے ہیں کیونکہ یہ دور پاکستان کے سیاسی تاریخ میں ایک نیا موڑ لاتا ہے کیونکہ اس دور میں پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ اور یہ سب حکمرانوں کی مفاد پرستی کی بدولت ہوا۔ کیونکہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں دو الگ الگ رہنماوؤں کو اکثریت حاصل تھی اور ان دونوں میں سے کوئی بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا حلانکہ اس دور کو جمہوری دور تصور کیا جا رہا تھا کیونکہ اس دور میں اظہار رائے کی مکمل آزادی تھی اور عوام کو ان کے ووٹ کے ذریعے حکمران منتخب کرنے کا اختیار تھا۔ لیکن اتنی بات کے بعد پاکستان دو حصوں میں بٹ گیا اور فسادات رونما ہوئے۔ اِس سارے عمل میں اس مظلوم طبقے کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا جو کہ غیر بنگالی تھے اور مشرقی پاکستان میں بستے تھے۔ اس لیے جونؔ اس پورے دور کے تمام واقعات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان غیر بنگالیوں کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں جو ان فسادات کی زد میں آئے اور تقسیم کے بعد بھی انہیں دونوں ملکوں میں سے کوئی ملک بھی قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔

اس کے ساتھ جونؔ انشائیہ "افسوس" میں اس دور کے حوالے سے ایک اور بات کو سامنے لاتے ہیں کہ گزشتہ تمام ادوار میں جو بھی حکمران آئے انہوں نے ادیبوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور نہ ہی لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کی۔ لیکن جونؔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور کے حوالے سے کافی پُر اُمید تھے کہ اس دور میں ادیبوں پر خاص توجہ دی جائے گی اور ان کے حقوق انہیں دیے جائیں گے کیونکہ اس دور کا وزیر اطلاعات ایک شاعر تھا۔ جونؔ کے انشائیوں سے اس بات کا بخوبی پتہ چلتا ہے کہ جس طرح سماجی موضوعات کے حوالے سے انہوں نے ہر چھوٹے بڑے معاشرے کے پہلو کو اپنے انشائیوں میں بیان کیا ہے کہ بالکل اِسی طرح سیاسی حوالے سے بھی جونؔ نے خاص خاص سیاسی ادوار، واقعات اور اہم امور کو نہایت عمدہ اور موثر طریقے سے اپنے انشائیوں کا موضوع بنایا۔ پاکستان کا آئین جو کہ ۲۵ سال بعد بنا اس کے حوالے سے بھی جونؔ نے اظہارِ خیال کیا اور اس کے نافذ ہونے کے لیے اور اس پر عمل درآمد کرنے کے لیے کئی اُمیدیں باندھنے کے ساتھ ساتھ نیک

خواہشات کا بھی اظہار کیا۔ اس کے علاوہ جونؔ کی اس سیاسی جماعت جو کہ آزادی سے پہلے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تھی کو بھی جونؔ اپنے انشائیے میں جہاں لائقِ قین قرار دیتے ہیں وہیں اسے ہدفِ تنقیہ کا نشانہ بھی بناتے ہیں۔ کیونکہ ایک طرف یہ جماعت مسلمانوں کی آزادی کے لیے کوشاں تھی تو دوسری طرف اِسی سیاسی جماعت نے پاکستان کی بنیادوں میں نفرت شامل کر دی اور یہ نفرت ہندوؤں سے دشمنی کی صورت میں سامنے آتی ہے اور جونؔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس جماعت کو صرف تین شخصیات محمد علی جناح، لیاقت علی خان اور خواجہ نظام الدین کے علاوہ باقی تمام مفاد پرست سیاستدان ہیں اور اس کے ساتھ ہی جونؔ مسلم لیگ کی تشکیلِ نو پر اس جماعت کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہیں۔

اِسی طرح جونؔ اپنے انشائیوں میں پاکستان کے دیگر ممالک کے ساتھ تعلقات پر بھی بات کرتے ہیں اور اس سلسلے میں پاک ایران دوستی کے ساتھ ساتھ پاک بھارت دشمنی پر بھی تفصیل سے بات کرتے ہیں۔ کہ یہ دونوں ہمسایے ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے لیے نفرت کا جذبہ رکھتے ہیں اور اس نفرت کا اظہار وہ کئی معاہدے ہیں جو آج تک اپنے انجام کو نہ پہنچ سکے اور خاص مسئلہ کشمیر جس کا آج تک کوئی حل نہ نکل سکا اور اِسی طرح پاکستان اور بھارت کے درمیان ہونے والی جنگیں بھی اِس نفرت کا واضح اظہار ہے حلانکہ اِن دونوں ممالک نے اِس نفرت سے آج تک کچھ حاصل نہیں کیا بل کہ اس نفرت کی وجہ سے یہ دونوں ممالک ترقی کی دوڑ میں دیگر ممالک سے پیچھے رہ گئے ہیں۔

پاکستان کی سیاسی صورتِ حال کے علاوہ جونؔ عالمی سیاست پر بھی نگاہ رکھتے تھے۔ اور جونؔ نے سیاست کے حوالے سے اہم واقعات کو اپنے انشائیوں میں بھی بیان کیا ہے۔ جیسا کہ امریکا اور روس کی جنگ کے امکانات پر اظہارِ تشویش کرتے ہیں اور امریکا کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ یہ روس کو ایٹمی جنگ پر اکسا رہا ہے حلانکہ امریکا بات بخوبی جانتا ہے کہ اگر ایٹمی جنگ ہوئی تو اس سے نہ صرف یہ دونوں ممالک تباہ ہو گئے بلکہ اس کا اثر دیگر ممالک پر بھی پڑے گا اور آنے والی کئی صدیاں اس کے اثرات سے بچ نہیں پائیں گے اور یہ ممالک خود کو جدید ترقی یافتہ ممالک اور تہذیب کی صف میں تو کھڑا کرتے ہیں لیکن در حقیقت یہ آج بھی صدیوں پہلے وحشی دور میں زندگی گزار رہے ہیں جہاں انسانی جانوں کی کوئی قدر نہیں کی جاتی تھی۔ اِسی طرح جونؔ عالمی سیاست کے حوالے سے ایک اور اہم واقعے سے ہمیں آگاہ کرتے ہیں اور اسے اپنے انشائیے میں انتہائی موثر انداز میں پیش کرتے ہیں اور اقوامِ متحدہ اور ان مغربی ممالک کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں جنہوں نے افریقہ کی تحریک آزاد کے ہیرو پیٹرس بومبا کے قتل پر آواز بلند نہیں کی۔ اس سلسلے میں جونؔ دیگر مغربی ممالک اور

خاص کر اقوامِ متحدہ کو اپنا فرض ادا کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔ اِس کے ساتھ ہی جونؔ اپنے ایک اَور انشائیے میں جنوبی افریقہ کے ان سفید فام حکمرانوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں جو نسلی امتیازات کو قائم کیے ہوئے ہیں اور کالے لوگوں کی نسل کشی کر کے انہیں اپنے یہ وطن سے نکالنے کے درپے ہیں۔ اس لیے جونؔ کے مطابق اِن حکمرانوں کے خلاف تمام امن پسند ممالک کو مل کر جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس ظلم کو روکا جاسکے۔

جونؔ نے تقریباً ہر ایک موضوع پر قلم اُٹھایا ہے اور نہ صرف انہوں نے ہر موضوع کے متعلق انشائیے لکھیں بل کہ ان انشائیوں میں نہایت عمدگی کے ساتھ اِن موضوعات کو بیان کیا ہے۔ جونؔ چونکہ ایک ادیب اور شاعر تھے اس لیے یہ جہاں دیگر موضوعات کو اپنے انشائیوں میں بیان کرتے ہیں وہیں فلسفے کے حوالے سے بھی اِن کے عمدہ انشائیے ملتے ہیں۔ جونؔ عقل کی مخالفت کرنے والوں کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ فلسفے کی اہمیت کو بھی بیان کرتے ہیں۔ اِسی طرح لفظ کی اہمیت، لفظ اور معانی کا رشتہ، زماں و مکاں کا فلسفہ، یاسیت پسندی، انسانی وجود کے بے مقصد ہونے کے حوالے سے، ترقی کے لیے خواب کی اہمیت، عدم اور وجود کا فلسفہ، خیر و شر کا تصور، انسانیت کا فلسفہ اور منافقت کے حوالے سے جونؔ فلسفیانہ انداز میں بحث کرتے ہیں۔

فلسفے کا تعلق عقل اور حکمت سے ہے اِس لیے جونؔ دانائی اور حکمت کے راستے کو کامیابی کا راستہ کہتے تھے کیونکہ حکمت کو اپنانے سے ہی ترقی کی منازل طے کی جاتی ہیں کیونکہ آج تک جتنی بھی قوموں نے کامیابی حاصل کی اور جتنے بھی سلاطین فتح سے ہمکنار ہوئے وہ حکمت کو اپنا کر ہی اس مرتبے تک پہنچے کہ کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ اِس لیے جونؔ فلسفیانہ موضوعات پر مبنی انشائیوں میں فلسفے کی اہمیت سے قوم کو روشناس کراتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان لوگوں کا ذکر بھی کرتے ہیں جو کہ ہمیشہ عقل کی مخالفت کرتے ہیں اور اسی عقل کی مخالفت کرنے والوں نے جس طرح قدیم دور میں فلسفیوں کو سزائیں دی بالکل اِس طرح آج کے دور میں بھی انہیں لعن طعن کا نشانا بنایا جارہا ہے اور ان فلسفیوں کو وہ اہمیت و مقام نہیں دیا جارہا جو اِن کا حق ہے۔ اِس لیے جونؔ اس اہم موضوع کا اظہار اپنے انشائیے میں کرتے ہیں۔

اِسی طرح جونؔ جہاں لفظ کی اہمیت بیان کرتے ہیں اور اسے تمام رشتوں کا بنیاد تصور کرتے ہوئے علم کی بنیاد گردانتے ہیں وہیں یہ لفظ اور معانی کے فلسفے کو بھی نہایت فلسفیانہ انداز میں بیان کرتے ہیں کیونکہ آج تک لفظ اور معنی کے رشتے اور تعلقات کے حوالے سے بہت سی بحثیں کی گئی ہیں اور ہر ایک فلسفی نے اپنے اپنے انداز سے اِس تعلق کو بیان کیا ہے۔ لیکن جونؔ نے اس بحث اور فلسفیوں کی آراء بیان کرنے کے ساتھ

ساتھ اپنے بھی خیالات کا اظہار کیا ہے اور جونؔ کے مطابق کسی بھی لفظ کے ایک مخصوص معنی نہیں ہوتے بل کہ ایک سے زیادہ معنی ہوتے ہیں۔

نثر، شاعری اور فلسفے کا ایک اہم موضوع وقت رہا ہے اور چونکہ زماں و مکاں کی بحث زندگی کی ہر بحث کا بنیاد موضوع رہا ہے اِس لیے جونؔ نے بھی اس بحث پر عمدہ انشائیے لکھے جس میں جونؔ زمانے اور وقت کے فلسفے کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے اور اس فلسفے کے حوالے سے مختلف فلسفیوں کی گئی تعریفوں کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اِن کی آراء کو سمیٹنے کی کوشش بھی کی گئی ہیں۔ یہ فلسفہ جونؔ نے اپنے انشائیے "وقت" میں بیان کیا ہے اِسی طرح جونؔ نے اِسی عنوان سے ایک اور انشائیہ بھی لکھا ہے اور اس میں بھی جونؔ نے اِسی بحث کو چھیڑا ہے اور ماضی، حال اور مستقبل کی تقسیم میں وقت کو بیان کیا ہے۔

جونؔ کے انشائیوں میں باسیت پسندی واضح انداز میں نظر آتی ہے اور وہ اپنے متعدد انشائیوں میں وجودی بحران کے کرب میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اِن کے مطابق انسان بے مقصد زندگی گزار رہا ہے۔ جسے اپنی منزل کا علم نہیں ہے۔ اس لیے جونؔ ایک طرف انسان کی بے مقصد زندگی کا تذکرہ کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ اِن کے وجود کو بھی یکسر بے معنی تصور کرتے ہیں کیونکہ جب ایک چیز بے مقصد ہو گی تو اس کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جونؔ کہتے ہیں کہ اپنے مقاسد اور درس سمت کا پتہ لگانے کے لیے دانش وروں کی طرف رجوع کرنا چاہیے کیونکہ یہی انہیں صحیح منزل کی پہنچا کر اسکتے ہیں۔ جونؔ جہاں دانش وروں کی حکمت کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کرتے ہیں، وہیں جونؔ اپنے ایک اور انشائیے میں خواب کے حوالے سے بھی ان دانش وروں کا ذکر کرتے ہیں کیونکہ انسان اپنی منزل اور ممقصد کے لیے کوشش اسی صورت میں کرے گا جب وہ خواب دیکھے گا۔ جب انسان ترقی کے حواب دیکھتا ہے تب ہی وہ آگے بڑھنے کے لیے جستجو کرتے ہیں۔ اس لیے جونؔ خوابوں کے حوالے سے بھی فلسفیوں کے خوابوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں کیونکہ ان کے خواب عام لوگوں کی نسبت دیر پا ہوتے ہیں کیونکہ ان کی نظر وقتی فوائد پر نہیں ہوتی بل کہ یہ دور کو سوچتے ہیں اِسی طرح جونؔ اپنے ایک اور انشائیے "جنتِ ارضی-۲" میں خوابوں کے حوالے سے ہی بات کرتے ہیں کہ اُمید کی صورت کبھی نہیں چھوڑنی چاہیے کیونکہ خواب اور امید کے بل پر ہی ترقی کی جا سکتی ہے اور ہم اپنی محنت اور کوشش سے ہی اس دنیا کو اپنے لیے مثالی معاشرہ بنا سکتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اِس دکھ کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ پہلے لوگ خواب دیکھتے تھے اور پُر اُمید تھے لیکن اَب لوگ مایوسی کا شکار ہو کر ترقی کی اُمید چھوڑ چکے ہیں۔

جونؔ کے انشائیوں میں جہاں یاسیت پسندی ملتی ہیں وہیں رجائیت بھی نظر آتی ہے کیونکہ جونؔ اپنے انشائیوں میں بے مقصد گزارنے والوں کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ ایسے افراد کا تذکرہ بھی کرتے ہیں جن کی زندگی پورے شعور کے ساتھ ایک مقصد کے تحت چل رہی ہوتی ہے اور وہ اپنے شعور کی بدولت بلند مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ اِسی طرح انشائیہ "پھوہڑ" میں بھی جونؔ وجودی بحران کے کرب کا شکار ہیں اور اس کے ساتھ ہی اپنے ایک اور انشائیے میں اپنی رائیگانی کی کیفیت کا اظہار بھی فلسفیانہ انداز میں کرتے ہیں۔ اِن تمام موضوعات کے ساتھ ساتھ سقراط کے خیر اور شر کے فلسفے کو بھی نہایت عمدگی بیان کرتے ہیں اور واضح کرتے ہیں کہ وہ قوتیں اچھائی اور بُرائی ہر وقت بر سرِ پیکار رہتی ہے۔ لیکن اچھائی کی ہی بالآخر فتح ہوتی ہے۔ اِسی طرح انسانیت کے فلسفے کو بھی اپنے انشائیے میں بیان کرتے ہیں اور انسانوں کے ایک جیسے مقام و مرتبے کے باوجود کم علمی کی بناء پر اس کو گروہوں میں بانٹ کر کم تر اور بدتر مقام دینے پر افسوس کا اظہار کرنے کے ساتھ تنقید بھی کرتے ہیں اور فلسفے کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کرتے ہیں کیونکہ فلسفہ سے نہ صرف شعور پیدا ہوتا ہے بل کہ یہ حقیقت کو سامنے لاتی ہے اور انسانوں کو صحیح راستے کی طرف رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ اِسی طرح جونؔ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کے حوالے سے اور انسانوں کے اندر پائے جانے والی منافقت کو فلسفیانہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔

اِسی طرح جونؔ انسانی سوچ کے اختلافات اور مختلف قوموں کے عروج و زوال کو فلسفیانہ انداز میں پیش کرتے ہیں اور شور کی اہمیت سے آگاہ بھی کرتے ہیں اور خود پر بھروسہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں کیونکہ خود پر بھروسہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ کیونکہ خود پر بھروسہ کر کے ہی فتح حاصل کی جاسکتی ہے اور اس بات کو بھی بیان کرتے ہیں کہ جو قوم کے لیے سوچتے ہیں وہ بظاہر تو اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں لیکن وہ اپنی سوچ اور فکر کی صورت میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

تاریخی حوالے سے بھی جونؔ نے متعدد انشائیے لکھیں جس میں کبھی تو وہ قوموں کے عروج وزوال کو موضوعِ بحث لاتے ہیں تو کبھی تاریخ کے شور سے واقفیت نہ رکھنے پر قوم کو تنقید کا نشانہ بناتے یہں۔ تو کبھی بغداد کی شکست کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی تاریخ کے فرقے خوارج کی اچھائیوں اور برائیوں کو قوم کے سامنے لاتے ہیں۔ کاغذ کی اہمیت کو مختلف تاریخی مثالوں سے واضح کرتے ہیں۔ اِسی طرح کبھی تخلیقِ کائنات اور انسانی زندگی کے آغاز اور کبھی تہذیب کے حوالے سے اپنے انشائیے میں بات کرتے ہیں یوں جونؔ

ادبی تاریخ، سیاسی اور اسلامی تاریخ سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے جس کا اظہار اِن کے انشائیوں سے ہوتے ہیں کیونکہ انہوں نے اِن تینوں تاریخوں کے حوالے سے اہم واقعات کو انشائیوں میں بیان کیا ہے۔

جونؔ نے تاریخ کے حوالے سے انشائیے "خاکے" میں قوم کو اپنی تاریخ سے سبق سیکھنے کی نصیحت کی ہے کیونکہ قومیں اپنے ماضی سے ہی سبق حاصل کرتی ہے اور ماضی میں کی گئی غلطیوں کو دوبارہ سرزد نہیں ہونے دیتی لیکن ہم نے ماضی سے سبق نہیں سیکھا اور جس طرح ماضی میں دیگر قومیں تباہ ہوئی بالکل اِسی طرح ہم بھی تباہی کے دہانے پر آ گئے ہیں کیونکہ ہم بھی ماضی کی طرح اصل مسائل کو فراموش کر کے فروعی مسائل پر توجہ دے رہے ہیں۔ اِسی طرح اور انشائیے میں بھی جونؔ ماضی سے سبق نہ سیکھنے پر قوم کی تباہی کا ذکر کرتے ہیں۔ اور بہادر شاہ ظفر کی سلطنت کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ اِس کے ساتھ ہی جونؔ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس طرح ماضی میں ایسے لوگوں پر بھروسہ کیا گیا جو کہ بھروسے کے قابل نہیں تھے اور قوم انہیں اپنا مسیحا سمجھ بیٹھی تھی بالکل اِسی طرح آج بھی ماضی کی وہی باتیں دہرائی جارہی ہے۔ حلانکہ اپنے ماضی سے سیکھ کر سبق حاصل کرنے چاہیے۔ تاریخ کے شعور کو جونؔ بہت اہمیت دیتے تھے اور اس حوالے سے وہ اپنے انشائیوں میں قوم کو تاریخ کو جاننے کی تلقین کرتے تھے۔ کیونکہ جو قومیں اپنی تاریخ سے آگاہ ہوتی ہیں وہی کامیاب ہوتی ہیں۔

جونؔ علم کی اہمیت کو بھی بیان کرتے تھے کیونکہ اس کی بدولت نہ صرف انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا گیا بل کہ انسان نے اِسی علم کے بل بوتے پر ترقی حاصل کی۔ اس طرح جہاں مسلمانوں نے اِس علم کو اپنا کر دوسری قوموں پر برتری حاصل کی تھی وہیں جب اِس علم سے انہوں نے رشتہ توڑا تو اِن کی تہذیب زوال کا شکار ہوئی۔ اس لیے جونؔ اِس حوالے سے اپنے انشائیے میں کہتے ہیں کہ آج اِسی علم کو مغرب والوں نے اپنا کر ترقی حاصل کر لی اور مسلمان بُری طرح شکست سے دوچار ہوئے۔ اِس طرح یہ علم ایک طرف تو انسان کو اشرف المخلوقات کے درجے پر فائض کرتا ہے اور دوسری طرف اس کی بدولت انسان قتل و غارت اور دہشت و بربریت کی فضا کو جنم دیتا ہے اس کی مثال جونؔ تاریخ سے چنگیز خان کی دیتے ہیں۔ جس نے بہت بڑی تعداد میں افراد کو قتل کیا۔ اِسی طرح جونؔ بغداد کی شکست کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ یہ علم و دانش کا یونان کے بعد سب سے بڑا مرکز تھا لیکن پھر ہلاکو خان نے بغداد کو تباہ کرایا۔ یوں تاریخ میں بھی علم و حکمت کی مخالفت کی جاتی تھی اور آج بھی یہی صورتِ حال ہے لیکن اب اس مخالفت کے باوجود علم کی بناء پر ہی ترقی ہوتی ہے کیونکہ یہ دور علم و دانش کا دور ہے۔

جونؔ علم کی اہمیت کے ساتھ ساتھ کاغذ کی اہمیت کو بھی اپنے انشائیے میں بیان کرتے ہیں اور تاریخ سے مختلف مثالیں دیتے ہیں کہ ابتداء میں کن کن چیزوں پر تحریر درج کی جاتی تھی اور پھر کاغذ کی اہمیت بیان کرتے ہیں۔ جس کی بدولت ہم ہر طرح کی تاریخ سے آشنا ہوئے۔ اِس کے ساتھ ساتھ جونؔ ادب کی تاریخ سے ان لکھاریوں کا ذکر بھی کرتے ہیں جو کہ اس دنیا سے چلے جانے کے باوجود ادبی تاریخ میں آج بھی زندہ ہیں۔ اِسی طرح اسلامی تاریخ کے حوالے سے جونؔ خوارج فرقے کے حوالے سے بات کرتے ہیں جو کہ حضرت علی اور حضرت امیر معاویہ کی جنگ کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس فرقے کی اچھائیوں اور برائیوں کو جونؔ نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ جونؔ اپنے انشائیے "نسب نامہ" میں عرب اور اسرائیل کی جنگ اور اسرئیل کی ہٹ دھرمی کو بیان کرتے ہیں اور اسرائیل کی شکست کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

جونؔ جہاں تاریخ کے دیگر واقعات کو بیان کرتے ہیں وہاں اس واقعہ کا ذکر بھی کرتے ہیں جب مسلم لیگ کے دور ہنماوؤں کو لانا ابو الکلام آزاد اور قائد اعظمؒ کو ۱۹۳۸ء میں شیعہ سنی فسادات کے نتیجے میں لوگوں نے تعصب پر ابھارنا چاہا لیکن ان دونوں رہنماوؤں نے ان تمام مطالبات کو رد کرتے ہوئے پوری سمجھ داری کے ساتھ ان فسادات کو انتہائی مختصر وقت میں ختم کر دیا۔ اس لیے جونؔ اس تاریخی مثال سے سبق سیکھ کر آئندہ ان فسادات کے رونما ہونے پر ایسے ہی فکر تدبر کا مظاہرہ کرنے تلقین کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ جونؔ انشائیے "میں اور کیا کہ سکتا ہوں" میں سر سید احمد خان کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں اور پاکستان اور مسلمانوں کے لیے ان کی تمام کوششوں کو سراہتے ہیں۔ اِسی طرح جونؔ تخلیقِ کائنات اور آغازِ زندگی کے حوالے سے بھی مختلف نظریات کو بیان کرتے ہیں جن میں اسلامی نظریہ، سائنسی نظریہ اور بگ بینگ کا نظریہ شامل ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی بیسویں صدی کے متعلق کچھ خدشات اور بہت ساری نیک خواہشات کا ذکر کیا ہے۔

جونؔ اپنے تاریخی موضوعات میں جانبدار اور غیر جانبدار تاریخ کے حوالے سے بھی بات کرتے ہیں کہ وہی تاریخ حقائق پر مبنی ہوتی ہے جو کسی غرض اور روپے پیسے کی حرص کے بغیر لکھی جاتی ہے۔ غیر جانبدار تاریخ میں محقق تاریخ کے واقعات کو اپنی منشا یا کسی اور کی منشا کے بغیر درج کرتے ہیں۔ لیکن جہاں غیر جانبدار تاریخ لکھی جاتی ہے وہیں جانبدار تاریخ بھی ملتی ہے۔ اِسی طرح جونؔ تاریخ کے حوالے سے سرکاری ٹی۔ وی پر چلنے والے ڈرامے کا ذکر بھی کرتے جس میں ظالم کو مظلوم اور مظلوم کو ظالم بنا کر دکھایا گیا ہے۔ اس کی مثال ہارون رشید کے ہاتھوں برمکی خاندان کی تباہی ہے۔ اس طرح محمود غزنوی اور فردوسی کے درمیان "شاہنامہ اسلام" لکھنے پر طے کیے گئے معاوضے پر سے مکر جانے پر بھی فردوسی کو غلط اور محمود غزنوی کو ایک خدا ترس اور

رحم دل قسم کا انسان بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اِسی طرح اورنگ زیب عالمگیر اور دار شکوہ کے معاملے میں بھی یہی حال ہے۔

اِسی طرح جونؔ بر صغیر کے المیوں کا ذکر بھی کرتے ہیں جب اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھوں ایک مشہور صوفی بزرگ اور منصور دورج کے مقلد شیخ سرمد کی موت کا واقعہ بیان کرتے ہیں اور یہ سفر انہیں ان لحق کا نعرہ لگانے پر ملی۔ اِسی طرح جونؔ 1857ء میں انگریزوں کے دورِ حکومت میں مسلمانوں کی صورتِ حال کا ذکر بھی کرتے ہیں اور "تہذیب" کے عنوان سے بالترتیب چھ انشائیوں میں ہندوستان کی تاریخ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف تہذیبوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ اِس کے ساتھ ہی عمر بن قاسم کے ہاتھوں راجہ دہر کی شکست اور بنو عباس اور سندھ میں اسلاعیلی مکتبہء فکر کے لوگوں کی حکومت کو بھی سرسری انداز میں بیان کرتے ہیں اور مسلم تاریخ کو بھی اپنے انشائیوں میں بیان کرتے ہیں۔

علمی و ادبی موضوعات کے حوالے سے اگر کے انشائیے دیکھے جائیں تو اُردو زبان کے آغاز شمال ہند او رجنوبی ہند میں اُردو کے مستقبل، جامع عثمانیہ کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ جامعہ عثمانیہ سے پہلے کے قائم کردہ تعلیمی اِداروں کا ذکر ملتا ہے۔ اِسی طرح اُردو کی خدمات کی وجہ سے عبدالحق کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی اُردو اور ہندی کو ایک ہی زبان قرار دیتے ہیں۔ جو انگریزوں کی سازش سے دو حصوں میں تقسیم ہوئی۔ جونؔ ادب کے لکھاریوں کا ذکر بھی کرتے ہیں اور ادیبوں کی ناقدری پر معاشرے سے شکوہ بھی کرتے ہیں اور فن کاروں کی معاشی ناآسودگی کو بھی بیان کرتے ہیں۔ اقبال کی شاعری کو مسخ کرنے پر اور انہیں ایک مذہبی شخصیت کے طور پر پیش کرنے پر معاشرے سے شکوہ بھی کرتے ہیں۔ فکری جمود اور سکوں کے درمیان سرحدیں نہ ہونے پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

جونؔ زبان کے حوالے سے اپنے انشائیے میں کہتے ہیں کہ جس طرح کوئی زبان فوراً وجود میں نہیں آ جاتی بالکل اسی طرح اُردو زبان بھی یک دم سے وجود میں نہیں آئی بل کہ اس زبان کے ارتقا کا عمل صدیوں پر محیط ہے اور اس زبان کے حوالے سے مختلف نظریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کے ہندوستان آنے پر اس زبان کا آغاز وارتقاء شروع ہوا اور پھر ترقی کر کے یہ زبان موجودہ حالات تک پہنچی۔ اور جونؔ اُردو اور ہندی کو ایک ہی زبان خیال کرتے ہیں۔ جسے انگریزوں نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تا کہ باقی مسائل کی طرح زبان کا مسئلہ بھی ان دونوں قوموں کے درمیان نفرت کو پھیلا سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ جونؔ شمالی ہند اور جنوبی ہند میں اُردو زبان کے مستقبل کے حوالے سے بھی بات کرتے ہیں۔ شمالی ہند کے مقابلے جنوبی ہند میں اُردو زبان

کی حالت قدرِ بہتر ہے کیونکہ شمالی ہند میں اُردو کا مستقبل تاریک ہوتا دکھائی دیتا ہے اور صرف بہار وہ علاقہ ہے جہاں اُردو کی حالت کچھ بہتر ہے۔ شمالی ہند میں اُردو کے لحاظ سے صرف جو بات اچھی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں اُردو کو مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترک زبان خیال کیا جاتا ہے لیکن مشاعرے دیوناگھری زبان میں ہی ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں جنوبی ہند میں اُردو مادری زبان تو نہیں ہے لیکن اختیار زبان کا درجہ ضرور رکھتی ہے۔ اور یہاں کئی علاقوں کی نسبت اُردو رسم الخط اور اس کی تعلیم کی بنیاد زیادہ مضبوط ہے اس طرح جنوبی ہند میں اس زبان کو علمی، تعلیمی اور تخلیقی زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ اِسی طرح جنوبی ہند دکن اور اس کے مختلف اضلاع میں اُردو کے استعمال اور فروغ کے حوالے سے بات کرتے ہیں اور آندھرا پردیش جو کہ اُردو زبان و ادب کا مرکز رہا ہے کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ تامل ناڈو، کرناٹک اور کیرالا کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ جہاں اُردو رسم الخط پوری روانی کے ساتھ لکھا جاتا ہے اِسی طرح اُردو کے حوالے سے قائم کردہ جامعہ عثمانیہ جو کہ اُردو کی پہلی اور آخری جامعہ تھی کا ذکر رکنے کے ساھ اس کی تباہی کا نوحہ بھی سناتے ہیں کہ اب اس جامع میں اُردو کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جامع عثمانیہ سے پہلے کے قائم کردہ اداروں دلی کالج، اورینٹیل کالج، مدرسہ فخریہ اور طب کا مدرسہ کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

اُردو زبان کی خدمات کی وجہ سے جونؔ اپنے انشائیے میں عبدالحق کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی اُردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے وقف کر دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ادب کے مختلف لکھاریوں کا ذکر بھی کرتے ہیں جو کہ آج بھی ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں تاریخ میں زندہ ہیں کیونکہ اِن کی جڑیں ادب کی زمین میں پیوست ہو چکی ہیں۔ اِسی طرح فن کاروں کی معاشی ناآسودگی کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ ان کے پاس خوابوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور ان کی ناقدری کو بھی بیان کرتے ہیں کہ معاشرہ انہیں اِن کا وہ حق اور وہ مقام و مرتبہ نہیں دیتا جو ان کا حق ہے۔ ان تمام موضوعات کے ساتھ مشاعروں اور شاعروں کا تذکرہ بھی کرتے ہیں اور ان شاعروں کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں جو کہ خود اس قابل نہیں ہوتے کہ شاعری کر سکیں اِس لیے وہ دوسروں سے لکھواتے ہیں لیکن وہ اندازِ بیان کی بدولت مقام پا لیتے ہیں۔ ایسے ہی اقبال کی شاعری اور شخصیت پرستی کا بھی بیان ملتا ہے کہ شخصیت پرستی کی بناء پر ان کی شادی کو کچھ کا کچھ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ انسانی فکر کے ارتقا اور تخلیقی عمل یہ بھی بحث کرتے ہیں اور ملکوں کے درمیان قائم کردہ سرحدوں کی مخالفت کرتے ہیں۔

جہاں تک جونؔ کے انشائیوں کی نفسیاتی موضوعات کا تعلق ہے تو ان موضوعات پر بھی جونؔ پوری سچائی کے ساتھ انشائیے لکھتے ہیں اور نہ صرف جونؔ نے اپنی بل کہ پورے معاشرے کی انفرادی اور اجتماعی نفسیاتی کیفیات کو نہایت خوب صورت انداز میں اور عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جونؔ معاشرے کے افراد کی نفسیاتی کیفیت یا اس کے رویون میں اس رویے کو بیان کرتے ہیں۔ جس کے مطابق صرف وہی درست ہے اور اس کی ہی رائے مستند اور حقائق پر مبنی ہے اور یہ افراد صرف وہی سنتے اور سمجھتے ہیں جو کہ ان کی منشاو مرضی کے مطابق کیا جائے۔ اِس لیے معاشرے کا ہر فرد اس کیفیت میں گرفتار نظر آتا ہے اور یہی چاہتا ہے کہ صرف اِسی کی بات سنی جائے اور دوسرے اگر بولیں بھی تو اسی کی منشا کے مطابق بات کریں۔ جونؔ اس کیفیت کے نتائج کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ اس کی بدولت جھوٹ اس معاشرے اور اس کے افراد کی جڑوں میں پیوست ہو چکا ہے جس کی وجہ سے سچی بات کہنے والا نقصان اُٹھاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انسان کی اس کیفیت کا ذکر بھیکرتے ہیں جس کی بناء پر ہر ایک خود میں گم ہو کر رہ جاتا ہے اور دوسروں سے بے گانہ ہو جاتے ہیں۔

جونؔ اپنی نفسیاتی کیفیت کو بھی بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک مثالیت پرست ادیب تھے اور معاشرے کے تمام مسائل کو ختم کرنا چاہتے تھے تو جب یہ ایسا نہ کر سکے تو خود کو رائیگاں تصور کرتے تھے۔ اِس طرح ان کے ہاں یاسیت پسندی واضح انداز میں نظر آتی ہے۔ اور چونکہ یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے اس لیے اس میں انسان دوسروں سے بیزار ہونے کے ساتھ خود سے بھی بیزار ہو جاتا ہے اور بعض اوقات اس کے نتائج خودکشی کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ اِسی طرح جونؔ کے نفسیاتی انشائیوں میں خود کلامی کا عنصر بھی ملتا ہے وہ یا تو خود سے باتیں کرتے ہیں یا پھر اپنے تراشے ہوئے خیالی ہم ذادوں سے باتیں کرتے ہیں۔ اِسی طرح جونؔ معاشرے کے افراد کی اس کیفیت کو بھی بیان کرتے ہیں جو کہ معاشرے کے افراد پوری طرح سے اپنا چکے ہیں۔ جس وجہ سے سب ایک دوسرے کا بُرا چاہتے ہیں۔ صرف اپنے مفاد کا سوچتے ہیں۔ جبکہ دوسروں کو نقصان پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور معاشرے کے افراد ایک دوسرے سے لاتعلق ہو چکے ہیں۔ جونؔ معاشرے کے افراد کی اس سوچ کی تبدیلی کو نہایت عمدگی سے بیان کرتے ہیں۔

جونؔ نے اپنے انشائیے "چھٹا دن" میں اس قوم کی اس نفسیات کو بیان کیا ہے جس کی وجہ سے وہ خوابِ غفلت میں پڑی ہوئی ہے۔ جیسے اپنے زیاں کا اور اپنی تباہی و بربادی کا کچھ احساس نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جونؔ اس کرب کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ اظہار پر پابندی کے باعث وہ اپنے اندر کے کرب کو لفظوں کی صورت میں نہیں پیش کر سکتے۔ جس کی وجہ سے ان کے اندر کی آوازیں مرتی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ

معاشرتی ادب کے حوالے سے سوچ اور ادیب کے ساتھ ان کے رویے کو بھی عمدگی سے بیان کرتے ہیں اِسی طرح جونؔ نے فرقہ واریت اور کراچی کے حالات سے اپنی نفسیاتی کیفیت کو بھی بیان کیا ہے۔

مذہبی موضوعات پر مبنی جونؔ کے انشائیے زیادہ تر فرقہ واریت کے حوالے سے لکھے گئے ہیں کیونکہ جونؔ کا تعلق شعبہ مکتبہ ء فکر سے تھی اور شیعہ سُنی فسادات آئے روز منظرِ عام پر آتے تھے جس کی وجہ سے بہت سے مظلوم اور بے گناہ افراد موت کے گھاٹ اُتار دیے جاتے تھے۔ اس لیے جونؔ کے مذہبی انشائیوں میں اس شدت پسندی کے خلاف بہت نفرت دیکھنے کو ملتی ہے۔ جونؔ جہاں اس فرقہ واریت کو بیان کرتے ہیں وہیں ایسے رہنماوؤں کا بھی ذکر کرتے ہیں جو ان تعصبات کو ختم کرنے کے لیے کوشاں ہیں اور اس سلسلے میں "جمعیت متحدہ اسلامیہ" کے رہنماوؤں کی اس کاوش کو لائق تحسین قرار دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ جونؔ ان افراد اور ان مولویوں کا ذکر بھی کرتے ہیں جو مذہب کی آڑ لے کر اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور جو بات انہیں پسند ہوتی ہے اور اسے اسلام کا حوالہ دے کر جائز قرار دیتے ہیں۔ اِسی طرح جونؔ سائنس کی اس جدید ترقی میں حرف مذہب اسلام کو سائنس کے ہم آہنگ گردانتے ہیں۔

نتائج

جونؔ ایلیا ءبطور شاعر اپنا ایک ممتاز اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ کسی ادیب کے لیے ایک سے زیادہ جہات میں خود کو متعارف کرانا اتنا آسان فعل نہیں۔ کیونکہ اس طرح اُس ادیب کی شخصیت حصّوں میں بٹ جاتی ہے اور ہر حوالہ اُتنا مضبوط بھی نہیں رہتا۔ "جون ایلیا" کے انشائیوں کے مطالعے سے جو نتائج اخذ ہوتے ہیں وہ کچھ یوں ہیں۔

- جونؔ ایلیا کے انشائیوں کا طرزِ تحریر بے ساختہ ہوتا ہے۔ کچھ سفاک اور کہیں کہیں لب ولہجہ انتہائی تلخ ہو جاتا ہے۔
- جونؔ ایلیا کے بعض انشائیے ایسے ہیں جنہیں سیاسی حلقوں کی جانب سے حکومتی گرفت میں بھی لیا جا سکتا تھا۔ اس کی وجہ ان کے مزاج کی بے باکی نظر آتی ہے۔
- اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جونؔ ایلیا کے انشائیے، انشائیے کے فن کے عین مطابق ہیں۔ وہ اپنے معاشرے کے مسائل کا گہرا ادراک رکھتے ہیں اور شاعری کے ساتھ ساتھ انشائیوں میں بھی ان مسائل کے بیان پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔
- جونؔ ایلیا کے انشائیے معاشرے کی تلخ حقیقتوں کے عکاس ہیں وہ انشائیے کی روایت کے مطابق ہلکے پھلکے انداز سے قدرے دور نظر آتے ہیں۔ معاشرے کی تلخ حقیقتوں کے بیان میں وہ ہلکے پھلکے انداز پر اکتفا نہیں کر پاتے بلکہ اپنی حساسیت سے مجبور ہو کر تلخ اور ترش الفاظ بھی اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔
- جونؔ ایلیا کے انشائیوں میں موضوعات کا تنوع نظر آتا ہے انھوں نے سماجیات، سیاسیات، فلسفہ، تاریخ، مذہب اور نفسیات کے ساتھ ساتھ مختلف نوعیت کے علمی ادبی موضوعات پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔
- جونؔ ایلیا فرقہ واریت جیسے حساس موضوعات پ ر بھی قلم اُٹھاتے ہیں اور فرقہ واریت سے پید اہونے والے فسادات پر کھل کر اظہار خیال کرتے ہوئے حقائق کو قاری کے سامنے لاتے نظر آتے ہیں۔

- جونؔ ایلیا کے انشائیے اُن کے وسیع مطالعہ اور معلومات کے ذخیرے سے مزین نظر آتے ہیں۔ وہ جس موضوع پر بھی قلم اُٹھاتے ہیں اُس سے پورا انصاف کرتے دکھائی دیتے ہیں۔
- جونؔ ایلیا کے انشائیوں کی عبارت چُست، رواں، ہُشتہ و شگفتہ، خوش گوار اور دل نشین ہے لیکن زبان کے استعمال میں جونؔ بے باک نظر آتے ہیں وہ لاشعوری طور پر بھاری بھر کم الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جو بعض اوقات پڑھنے والے پر گراں گزرتے ہیں۔
- جونؔ بحیثیت شاعر ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ بطور انشائیہ نگار سامنے آنا ان کی ایک اور منفرد جہت ہے۔ ناقدین اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ جون کی شاعری کی طرح اُن کے انشائیے بھی توانا حیثیت کے حامل ہیں۔
- جون ایلیا کے انشائیوں کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ وہ معاشرے کے مسائل کا بیان کرتے کرتے ناصح کی طرح اپنے قاری کی اصلاح بھی کرنے لگتے ہیں۔

سفارشات

زیر نظر مقالے کو تحریر کرنے کے بعد درج ذیل سفارشات بھی پیش کی جاتی ہیں۔

- "جون ایلیا" کے انشائیوں کا موضوعاتی تجزیہ کیا گیا جبکہ جونؔ کے انشائیوں کی زبان کا جائزہ لینا الگ سے موضوع تحقیق بنایا جاسکتا ہے۔
- جونؔ ایلیا اور ان کے معاصرین کے ساتھ اِن کی نثر کا تقابل بھی تحقیق طلب موضوع ہے۔
- جونؔ ایلیا اور دیگر انشائیہ نگاروں کے اشتراکات اور اختراکات کا جائزہ لینا چاہیے۔
- جونؔ ایلیا کے انشائیوں کے موضوعات پر انفرادی طور پر تحقیقی مقالے لکھے جانے کی گنجائش موجود ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

۱۔ جونؔ ایلیا، "فرنود"، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء

تحقیقی اور تنقیدی کتب:

۱۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، "کشاف تنقیدی، اصطلاحات"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع دوم، ستمبر ۱۹۸۵ء۔

۲۔ انور سید، ڈاکٹر، "انشائیہ اُردو ادب میں"، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، جنوری ۱۹۸۵۔

۳۔ اعجاز فاروقی، "پاکستان کا فکری بحران"، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۵ء۔

۴۔ ای۔ ایم۔ جوڑ، "جدید سیاسی نظریے کا تعارف"، مترجم، عبدالعمی، مجلس رقی ادب، لاہور، طبع دوم، اکتوبر ۱۹۷۱ء۔

۵۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر، "تعکمات (ادبی، فکری اور تہذیبی کالم)"، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۰ء۔

۶۔ احمد ندیم قاسمی، "ندیم کی غزلیں (کلیات)"، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء۔

۷۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، "اُردو میں انشائیہ نگاری"، نذیر نسر پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء۔

۸۔ برٹرنڈ رسل، "نظامِ معاشرہ اور تعلیم"، مترجم، جی آر عزیز، فلپ، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع سوم، فروری ۱۹۸۸ء۔

۹۔ جمیل آذر، "اُردو کے بہترین انشائیے، پیشِ لفظ"، مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا، ۱۹۷۶ء۔

۱۰۔ جونؔ ایلیاء، "شاید"، الحمد پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۰ء

۱۱۔ طارق مغل محمود، "معاشرتی مفسیات"، اُردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۱۳ء

۱۲۔ علی عباس جلال پوری، " عام فکری مغالطے، فلقیات، لاہور، ۲۰۱۳ء

۱۳۔ عبدالحق حسرت کاسکنجوی، ڈاکٹر، "ادب، علمی اور فکری زاویے"، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۴ء

۱۴۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، مضامینِ "سرسید، (مقدمہ)"، مکتبہ خیابانِ ادب، لاہور، جنوری ۱۹۷۶ء

۱۵۔ قیوم نظر، "انشائیوں کا ایک مجموعہ"، سالنامہ اُردو زبان، سرگودھا، مئی جون ۱۹۶۸ء

۱۶۔ قیصر سلام، قاضی، "فلسفے کے بنیادی مسائل"، ایس ٹی پرنٹرز، راولپنڈی، طبع ہفتم، ۲۰۱۲ء

۱۷۔ گالینا کیرینکو، "لیدیا کورشنووا، فلسفہ کیا ہے"، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۶ء۔
۱۸۔ لطیف جاوید، "انسان، فلسفہ اور کائنات"، آکاش پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء۔
۱۹۔ مشکور حسین یاد، "ممکناتِ انشائیہ"، یولیمر پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء۔
۲۰۔ مبارک علی، ڈاکٹر، "تاریخ کے بدلتے نظریات"، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء۔
۲۱۔ مبارک علی، ڈاکٹر، "تاریخ کی باتیں"، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء۔
۲۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، "دوسرا کنارہ"، مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا، ۱۹۸۲ء۔

اخبارات:

۱۔ روزنامہ "جنگ" اسلام آباد، ۱۸ اپریل ۲۰۱۸ء